بدلتے رنگ شگوفوں کے

خالدہ شفیع

خالدہ شفیع کے افسانے مروّجہ معاشرتی ماحول اور اس میں متحرک کرداروں کے ایسے تجزیاتی مطالعے ہیں جن سے پاکستان کی ربع صدی کی معاشرتی اور تہذیبی تاریخ کے بعض پہلو مرتب اور منوّر ہو سکتے ہیں۔ دراصل خالدہ ہر معاشرتی صورت حال کی گہرائیوں میں اتر جاتی ہیں۔ وہ اس کے مسائل میں نفوذ کر جاتی ہیں اور پس منظروں اور پیش منظروں کو کھنگالتی ہوئی ایک ایسا افسانہ تخلیق کرتی ہیں جو فنی لحاظ سے بھی متوازن اور مکمل ہوتا ہے اور موضوع کے لحاظ سے بھی جس کی اہمیت اور سچائی مسلّم ہوتی ہے۔

احمد ندیم قاسمی

خالدہ شفیع باصلاحیت افسانہ نگار ہیں۔ ان کے افسانے اس امر کے متقاضی ہیں کہ انہیں انہماک اور دلچسپی سے پڑھا جائے۔ زیرِ نظر مجموعے کے بعض افسانے ایسے ہیں جن میں معاشرتی حقیقت نگاری کے رنگ بہت واضح ہیں۔ یہاں افسانہ نگار نے قلم سے نشتر کا کام لیتے ہوئے معاشرے کی دکھتی ہوئی رگوں کو چھیڑا ہے۔ بعض افسانوں میں کرداروں کی پیچیدہ نفسیات اور ذہنی کیفیات کو کاغذ پر منتقل کرنے میں خالدہ شفیع نے لفظی تصویر کشی، علامت اور تشبیہ کا سہارا بھی لیا ہے۔ خالدہ شفیع کی خصوصیت یہ ہے کہ ان کی ہر کہانی قاری کی توجہ کو اپنی جانب مبذول کیے رہتی ہے اور اس لطف و انبساط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹتا جو زندہ اور سچی تخلیق کی پہچان ہے۔

ڈاکٹر اسلم فرخی

بدلتے رنگ شگوفوں کے

بدلتے رنگ شگوفوں کے

افسانے

خالدہ شفیع

سیپ پبلی کیشنز، کراچی ۲۸

کتاب :	بدلتے رنگ شگوفوں کے
مصنفہ :	خالدہ شفیع
ترتیب و اہتمام :	نسیم درّانی
سرورق :	لیاقت حسین
کتابت :	شاہد ریاض
ناشر :	سیپ پبلیکیشنز، کراچی ۲۸
طابع :	احباب پرنٹرز، کراچی
تعداد بار اوّل :	ایک ہزار
سالِ اشاعت :	ستمبر ۱۹۸۳ء
قیمت :	۳۵۔روپے

اپنے بھائی

محمد صدیق (مرحوم)

کے نام

جو نہ صرف میرے پہلے قاری تھے بلکہ میری شناخت بھی تھے۔

چشم کو چاہیئے ہر رنگ میں، وا ہو جانا

غالب

مہک

اپنی بات

ہم سب مسافر ہیں لیکن مرد کی مسافرت اور عورت کی مسافرت میں فرق ہوتا ہے۔ پھر مسافر مسافر میں فرق ہوتا ہے۔ منزلوں کے تعین کے باوجود ہم بھٹکنا چاہتے ہیں۔ نئی جہتوں کی تلاش ہیں۔ خوب سے خوب تر کی جستجو ہیں۔ یہاں سے وہاں۔ سنگلاخ راستوں سے گزرتے۔ سرکنڈوں کی جھاڑیوں

کو عبور کرتے کبھی سبزہ زاروں میں نکل آتے ہیں اور کبھی پگڈنڈیوں پہ چلتے بادِ مست کے جھونکوں میں لہراتے مسکراتے پھولوں میں گھر جاتے ہیں اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ نیلے ٹھنڈے پانیوں کی ٹرل ٹرل اور اودے پہاڑوں کی پیشانی پر چمکتی برف ہماری آنکھیں خیرہ کر دیتی ہے۔ نیلگوں آسمان کی بسیط وسعتوں پر اڑتے سفید پرندوں کے ساتھ ہم بھی مائلِ پرواز کھو جاتے ہیں۔ لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ پھر اسی سمت، ان ہی راستوں کی جانب لوٹ آتے ہیں۔ ہم کھو نہیں جاتے۔ نہ جانے کیوں ہم کھو نہیں جاتے۔

خالدہ شفیع

چاندنی کا گھاؤ

چاند کی چاندی سی خنک روشنی میں بیٹھ کر سنہری خواب دیکھنے والی لبنٰی بیگم جب سے مس رؤف بن کر کالج میں آئی تھیں موٹی موٹی کتابوں کی لطافتوں اور رنگینیوں میں کھو کر یہ تو بھول ہی گئی تھیں کہ وہ اس جنس سے تعلق رکھتی ہیں جس کی گردن سے اتارا ہوا پٹّہ محض تفریحاً اتارا گیا ہے اور اسے وہ اپنی آزادی سمجھ بیٹھی ہیں، اور پھر اس اسٹیج تک پہنچنے کا یہ مطلب تھوڑا ہی تھا کہ وہ لوگوں کے قیاسات سے بھی بچی رہیں۔ معمول کی طرح اس دن بھی اردو کی کتاب لئے دیر تک اسٹاف روم میں بے تعلق سی بیٹھی رہی تھیں اور طلبہ، غیر معمولی طور پر بکھرے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔

سفید پتھر کی بنی ہوئی اس وسیع و عریض عمارت کے ٹینس کورٹ میں لڑکے، لڑکیوں کے بڑے سے گروہ سے ایک ٹولی الگ ہو کر بڑی سرعت سے اللہ دتہ چپراسی کے کوارٹر کی جانب کھسک آئی اور کل ہونے والے ورائٹی پروگرام

کے لئے ایک خفیہ آئٹم کی تیاری بھی جٹ گئی۔

"تھینک گاڈ۔ رفیعہ ناز نہیں ٹپکیں۔" منظور نے اچھل کر کہا اور ایک ٹوٹی پھوٹی الماری میں سے الم غلم چیزیں نکالنے لگا۔

"یار لڑکیاں تو بس "مٹروٹی" ہوتی ہیں۔ چہ۔ طاہر بھیا اتنا خراب کامپلیمنٹ نہ دیں۔ اوئی اللہ اچھے منظور بھائی۔ اس سے اس کا دل ڈوب ڈوب جائے گا۔ رفیق خواجہ، رفیعہ ناز کی نقلیں اتارتے اتارتے دھم سے منظور کے اوپر جاگرا۔

"دیکھو یار وہ یہ رہا کنگھیر۔ کون؟ شاہد نے بڑا سا چمکتا ہوا کنگھیر ہوا میں لہرایا۔

"طاہر بیگ،" سب چلائے۔ پھر بہت سی واہ واہ کی آوازیں گونجیں،" چل ڈال اس سفید ڈبے میں۔" زاہد نے کنگھیر نسیم کی طرف بڑھا دیا۔

"اور یہ رہی چمڑے کی بیلٹ شفیق سر کے لئے جن کی پاجامہ نما پینٹ ہمہ وقت بمائل زمین رہتی ہے۔ شاید ان کی نازک کمریا اس بار کی متحمل نہیں ہوسکتی۔" زاہد کہتا رہا اور چند لڑکوں کی واہ واہ۔

ہائے مار ڈالا۔ ویری گڈ کی آوازیں گونجتی رہیں۔

پھر اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور جھومتا ہوا سہاگ پڑا۔ بڑے اسٹائل سے چاروں طرف گھمایا۔ "مس رؤف دی گریٹ۔" بہت سے قہقہے گونجے اور دو لڑکوں نے زاہد کو کندھوں پہ اٹھالیا۔

"یار زاہد میرے خیال میں تم اس آئٹم کو نکال دو۔ کالج کا اسٹینڈرڈ پہلے ہی ــــ،، کوئی کہنے بھی نہ پایا تھا کہ پھر بہت سی آوازیں گونجیں۔

"ارے چھوڑو یار۔ مسوں کے پیچھے۔ سالی بوڑھی ہونے کو آئی ہے اور شادی ہی نہیں کر سکتی۔ اور مزاج دیکھو تو آسمانوں پہ۔ اور شاہنواز دبے پاؤں ہوا کی طرح کھسک آیا۔

مس رؤف نہ آئیں تو کتنا اچھا ہو" یہ اس کے دل کی آواز تھی۔ کتنی عجیب بات تھی۔ حالانکہ وہ ہمیشہ ایسی شرارتوں میں پیش پیش رہتا تھا۔ پہلے دو دن جب اس نے مس رؤف کی کلاس اٹینڈ کی تھی تو حسبِ معمول دوسرے لڑکوں کے ساتھ مل کر لڑکیوں کی سی آواز میں باتیں کرتا رہا تھا۔ چرچراتی آواز میں قہقہے بھی لگائے ایک آدھ بار ٹرانسسٹر سے گانے بھی سنے۔ آئینہ سے روشنی بھی پھینکی۔ حاضری کے دوران نام پکارے جانے پر کبھی "جی حضور"، "پریذیڈنٹ محترمہ"، "یہیں ہوں جی" اور لبیک بھی پکارا۔ لیکن جلد ہی مس رؤف نے اسے جالیا اور بغیر اعلان جنگ حملہ کر دیا۔ انہوں نے انتہائی شفقت بھری نیلی آنکھیں اس پر گاڑ دیں اور چند لمحوں تک دیکھتی رہیں۔ جوابی حملے میں اس نے بھی ان کی نیلی آنکھوں میں جھانکا۔ پھر اسے ہر بار یوں لگتا جیسے اس کی نیلی شفاف جھیلوں میں ڈوبتا چلا جا رہا ہے۔ گہرا۔ بہت گہرا۔

پڑھانا شروع کیا تو سیل سبک کی طرح سب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ان کی پرسکون آواز سب کو وائلن کے سروں کی طرح ڈوبتی ابھرتی محسوس ہوتی۔ سب پر جیسے مسمریزم ہو جاتا۔ شیلے کا قول ہے۔ ہمارے دل آفریں نغمے وہی ہیں جو درد آفریں ہوں اور یہی بات میر کے کلام پر صادق آتی ہے۔ آپ میں سے کسی کو انگلش لٹریچر سے دلچسپی ہے۔ کیٹس پڑھا ہے۔ اس کی Nightingale ، شیلے اور ٹینی سن کو جانتے ہیں۔ ان سب میں میر جھانکتا نظر آئے گا۔

Ah! yet the lips may faintly smile,

The eyes may sparkle for a while,

But never from that withered heart,

The consciousness of ill shall part.

مس رؤف کی مدھر رسیلی آواز میں علم کے موتی ان کے نازک لبوں پر جگمگایا کرتے۔

اور وہ بڑے وقار اور تمکنت کے ساتھ اپنی سفید براق ساڑھی کے پھیلتے ہوئے آنچل سے سانولی چکنی چمکتی گردن میں ننھا سا سنہری دل ڈھانپ لیتیں تو اس کو اپنا دل ڈوبتا محسوس ہوتا۔ لڑکیاں مر مر گئیں۔ لڑکے کلاس ختم ہوتے ہی فلک شگاف نعروں سے لڑکیوں کا مذاق اڑاتے۔

"چھوڑ یار لڑکیاں تو سب کی سب ہومو Homo ہوتی ہیں۔" اور شاہنواز مرے ہوئے قہقہے سے ان کا ساتھ دینے کی کوشش کرتا۔ نہ جانے کیوں۔ معلوم کیسے۔ میں۔ میں ان کی سانولی سلونی چمڑی میں سمٹ کر رہ گیا ہوں۔ ان کی نیلی جھیلوں میں ڈوب گیا ہوں اور مدھر رسیلی آواز میں بہک بہک جاتا ہوں۔ کس قدر مضحکہ خیز بات ہے نا۔ اس نے بارہا ان باتوں کا مذاق اڑایا تھا۔ محبت کا درد مشک کی خوشبو کی طرح چھپائے نہیں چھپتا۔ اور وہی ہوا۔ سب نے اسے کلاس میں ہمہ تن گوش بیٹھے دیکھ کر عجیب انداز میں ہوم ورک کی کاپیاں پکڑاتے وقت کھوئے کھوئے انداز میں اشعار کی تشریح کرتے وقت بری طرح چھیڑنا شروع کر دیا اور سب اپنی اپنی بولیاں بولتے۔

"برخوردار مرکھنی بڑھیا سے دل لگا بیٹھے ہیں۔"

"صاحبزادے آج کل اماں سے عشق فرما رہے ہیں۔"

"یار بس او ڈیپس کامپلیکس کا شکار ہے۔"

ایک دن جھنجلا کر شاہنواز نے سیکشن ہی بدل لیا۔

پڑھانے والا جب تک ڈوب کر نہ پڑھائے۔ پڑھنے والے میں لگن کہاں سے پیدا ہو۔ اس کا سب ہی کو اعتراف تھا۔ کیا یہ سچ ہے کہ ہر ایک اپنے آئینہ میں دوسروں کو دیکھتا ہے لیکن کیا وہ غیر معمولی نہیں جس کی آنکھیں نیلی ہیں جو ہر دم چنبیلی کی کلیوں کی طرح اداس نظر آتی ہے۔ اور جو کسی کو لفٹ نہیں دیتی (شاید یہی بات سب کو پسند تھی۔) اور جو پڑھاتی ہیں تو لگتا ہے علم کا سمندر موجیں مار رہا ہے۔

گرمیوں کی چلچلاتی دھوپ میں جب طلبہ کے ختم نہ ہونے والے ابلتے ہوئے قہقہے بھی تھم جاتے ہیں۔ مس رئوف اسٹاف روم کے ایک کونے میں کسی کتاب کو چاٹ رہی تھیں۔ اور ان کے قریب ہی رکھے ہوئے گلدان میں جوہی کی ننھی منی کلیاں ٹوٹ کر چاول کے دانوں کی طرح بکھری ہوئی تھیں۔ شاہنواز بہت دیر سے بیٹھا سوچ رہا تھا۔ کس طرح کل کے پروگرام میں آنے سے مس رئوف کو روک دے۔ جب کچھ بن نہ پڑا تو معمولی سے شعر کی تشریح پوچھ کے چلا آیا۔

لیکن ہوا وہی جو اس نے چاہا تھا۔ مس رئوف نے ورائٹی پروگرام اٹینڈ ہی نہ کیا۔ اور دوسرے دن کچھ لڑکیوں نے اسی بہانہ مس رئوف کو کلاس سے نکلتے وقت گھیر لیا۔ ان کی غیر معمولی مسکراہٹ اور پھر اطمینان سے قریب ہی پڑے ہوئے بنچ پر بیٹھتے دیکھ کر لڑکیوں کو شہ مل گئی۔ لڑکیوں نے جی بھر کے باتیں کیں۔ وہ اردو کے ٹیسٹ غالب کی فارسی دانی، اقبال کے فلسفہ خودی کی پیچیدگی سے پھلانگتی ہوئی نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچ گئیں۔ بقول کسے نوکر اور شاگرد کو ذرا جو ڈھیل دیں تو وہ سر پر سوار تابڑ توڑ جوتے برسانے سے بھی گریز نہ کریں۔ سہاگ پڑے والی بات بتادی۔ پھر مہ جبیں دجسے بد تمیز لڑکوں نے ننگی جوانی کا لقب دیا تھا) انتہائی لاڈ میں آکر مس رئوف کی انتہائی معمولی سی رنگ سے کھیلنے لگی۔ اور نہ جانے کہاں سے کہاں اس کی کڑیاں ملانے لگی۔ مس رئوف کا سانس تیز تیز چلنے لگا۔ نتھنے پھڑ پھڑائے اور اپنا بڑا سا ہینڈ بیگ سنبھالے اسی وقت اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"یہ بیل کب منڈھے چڑھے گی۔"

"ہیں تو سویٹ لیکن مزاج ذرا۔"

"دولھا ملے تو مزاج درست ہوں۔"

لڑکیاں فری پیریڈز میں سب پر یہ لاگ تبصرے کرتیں۔ جواب کسی نہ کسی طرح

ان کے کانوں تک پہنچنے لگے تھے۔ یہ کتنا عجیب اتفاق تھا جب مس رؤف باتھ روم میں داخل ہوئیں تو وہ گراؤنڈ میں باتھ روم کی دیوار کے ساتھ لگی بیٹھی لڑکیوں کی کھسر پھسر پر کان لگا بیٹھیں۔ "توبہ ہے کچھ معلوم بھی ہے۔ میری امی کیا کہتی ہیں۔" اس نے دوسری کے کان میں منہ لگایا۔ "مس رؤف کے گھر نت نئے اور نگے ہونگے مرد آتے رہتے ہیں۔ کبھی کبھی تو وہ ساؤنڈ پروف کر لیں۔"

مس رؤف کے ذہن میں چٹاخ پٹاخ کتنی گولے برس گئے اور سارے جسم میں کن کھجورے رینگ گئے ان کا درد بھرا دل چیکو پیکو روتا رہا۔ اس شام وہ اپنی کتاب کی اشاعت کے سلسلہ میں سر صفدر سے بھی نہیں ملیں۔ اماوس کی تاریک رات انہیں قبر سے بھی زیادہ ہولناک لگی۔ یہی روح کا عذاب ہے جو پھر لوٹ آیا ہے تو اس گناہ کے داغ کو جو میرا نہیں تھا اور جسے چھپانے کے لئے میں نے آٹھ سال صرف کر دیئے سب لے ایک ل گئے۔ مس رؤف نے اپنی گھٹی گھٹی سسکیوں کو بے دردی سے روک لیا۔ کیونکہ بیمار بوڑھی ماں نے ایک دم پوچھ لیا۔ بنتی رانی۔ تم تو نہیں ہو نا! اور اس کی چہیتی آیا سکینہ بی بی کا پلنگ بھی چرچرایا۔

حساس طبیعت انسان کو کہیں کا نہیں رکھتی۔ لیکن اگر یہ احساس ہو جائے کہ اس میں بہت سی باتیں ایسی ہیں کہ جو منفرد ہیں اور وہ چند باتوں میں مقابلتاً برتر ہے تو اعتماد کے بل بوتے پر درد کی شدت میں کچھ کمی آجاتی ہے جس سے زندگی کے ڈھنگ میں کچھ تبدیلی کی امنگ بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور شاید اسی چیز نے مس رؤف کو اس مقام پر لا کھڑا کیا تھا کہ وہ اب ایک کالج کی ہر دلعزیز سینئر لیکچرار تھیں جس نے اپنی طالبعلمی کے زمانے میں بے شمار انعامات بھی جیتے تھے اور یہاں تک پہنچنے کے لئے اس قدر زحمتیں بھی اٹھائیں کہ اسے بوکرٹی واشنگٹن کی آپ بیتی بھی ہیچ لگی۔ صبح جب وہ اٹھیں تو یوں لگا جیسے صدیوں سے جاگ رہی ہوں۔ بعض راتیں بے حد لمبی ہوتی ہیں۔ اس کا اندازہ انہیں

خوب تھا۔ یہ گھڑیاں اور پیمانے بڑی سطحی چیزیں ہیں۔ مس رؤف نے مرے ہوئے انداز میں ساڑھی گھسیٹی اور لپیٹ کر اسی وقار اور تمکنت کے ساتھ لیٹی ہوئی ماں کے سامنے جھک گئیں۔ ماں نے کانپتے ہوئے ہونٹ ان کی پیشانی پر رکھ دیئے۔ "اللہ تیرا نگہبان۔ میرے جیتے جی تیرے پھول کھلیں۔" وہی پرانی رٹی پٹی دعا دی جس سے وہ چڑتے چڑتے تنگ آ کر خاموش ہو چلی تھی۔ لیکن ابھی ابھی اس دعا میں کوئی انجانا اثر آ گیا تھا۔ پھر جب فائل درست کی اور بڑا سا بیگ اٹھایا تو نہ جانے کتنی دیر کھڑی سوچتی رہی۔ اس پڑھنے پڑھانے میں کیا رکھا ہے ان کی حالت کچھ ایسے حساس بچے کی تھی جسے اسکول میں پہلے ہی دن انتہائی شفقت سے پیش آتے ہوئے استاد سے چپت پڑ جائے۔ آج پہلی بار کالج میں داخل ہوتے وقت نظر اٹھا کر چوکیدار کو دیکھا۔ اس کا چہرہ بھی کچھ کہتا ہے۔ بوجھل قدموں سے ڈوبتے دل کے ساتھ نظریں بچاتیں اسٹاف روم میں داخل ہو گئیں۔ ان کی ہمت بالکل جواب دے گئی تھی۔ انہوں نے پیشانی سے پسینہ کے قطرے صاف کرتے ہوئے سوچا۔ میں کسی کو فیس نہیں کر سکتی اور اب کبھی نہ پڑھا سکوں گی۔

فرڈ پیریڈ کی گھنٹی کے ساتھ ان کا دل بھی اسی زور سے بجتا رہا جب کہ کلاس میں داخل ہوئیں، تو ٹانگیں اس طرح کانپ رہی تھیں جیسے لیکچر دینے کے لئے پہلی دفعہ قدم رکھا ہو۔ لیکن کچھ بھی تو نہ ہوا۔ معمول کی طرح جیسے سوتے پھوٹ نکلے مچلتے گاتے شور مچاتے جھرنے بہہ نکلے۔ اور اس امنڈتے دریا کی تیزی میں طلبہ قدم جماتے رہ گئے اور وہ خود بھی حیران رہ گئیں تو لیشرہ بیگم تم مس رؤف بننے کے لئے پیدا ہوئی تھیں۔ یہ اس قسم کی باتیں کرنے والی لڑکیاں ناسمجھ ہیں۔ پھر اس اعتماد نے درد کی شدت میں کمی کر دی۔ وہ شام کافی دیر تک سر صفدر سے اپنی کتاب کے متعلق باتیں کرتی رہیں۔

رات کی تاریکی میں ساڑھی کو اچھی طرح لپیٹے جب لکڑی کے دھب دھب بجنے والے زینے پر آہستگی سے قدم رکھتی اوپر چڑھنے لگیں تو سنا۔ اس کی زرد مریل ہمسائی جسے دیکھ کر

اوندھی چھپکلی کا خیال آتا تھا۔ بلند آواز سے اس کی ماں سے کہہ رہی تھی۔ ہوتا آخر کو ماں!۔ دیکھتی نہیں لڑکی کی رنگت۔ آنکھوں کے گرد حلقے اور بار بار ساڑھی کے آنچل سے خود کو لپیٹنا۔ اتنی رات گئے تک باہر رہنا۔ بی بی سچی باتیں سب ہی کو بری لگتی ہیں۔ تیرے ہی بھلے کو کہتی ہوں۔ محلہ بھر کے مرد مکان خالی کرانے پر تلے بیٹھے ہیں۔" مس رؤف کے داخل ہوتے ہی یوں بھاگی جیسے گھوڑے کو چابک دکھا دی جائے۔"

اماں میرا فلسفہ ہے غم مٹانے کے لئے اس سے بڑا غم کھاؤ اور بڑا غم مٹانے کے لئے اور بڑا غم کھاؤ۔ دق کے مرض کو ختم کرنے کے لئے دق ہی کے جراثیم داخل کئے جاتے ہیں۔ وہ دیر تک اماں اور اپنی چہیتی سکینہ سے باتیں کرتی رہی۔ اماں بے چاری اس بے طرح الجھے دھاگے کا سرا ڈھونڈتے ڈھونڈتے تھک گئیں۔

تو یہ چاندنی کا گھاؤ اس قدر گہرا تھا جس کے لئے اس نے آٹھ سال صَرف کر دیئے اور پھر جو دیکھا تو وہ جوں کا توں تھا۔ بشریٰ بیگم یہ گھاؤ اس طرح نہیں بھرا کرتے کیا ہی اچھی ہوتا کہ اگر بشریٰ رانی اس وقت سنگ مرمر کے فوارے سے سر پھوڑ کر مر جاتیں۔ مس رؤف نے بار بار گئی رات یہی سوچا۔ کروٹ بدلا کیں اور پلنگ چرچراتا رہا۔ پاس ہی لیٹی ہوئی سکینہ بی بی کو یوں لگا جیسے پلنگ روتا ہو۔ سجن اب تو آجاؤ۔ زیب بوا کہتی تھی۔ گئی رات تک اگر کسی کنواری کا پلنگ یوں چرچرائے تو وہ دکھی ہوتی ہے۔ پلنگ بھی روتا ہے۔ سجن اب تو آجاؤ۔ میرا جیا بہلا جاؤ۔ موری اندھیاری دنیا میں اجالا پھیلا جاؤ۔ موری آنکھیں برسیں جل تھل۔ نندیا بن کے سلا جاؤ۔ سکینہ بی بی کے ذہن میں بے ربط سے مصرعے ابھرتے چلے گئے اور اسی لمحے مس رؤف بشّی بے بی بن کر اس کے سر پہ سوار اپنی گڑیا کے کپڑے سلوا رہی تھی۔ پھر گول مٹول دیدے گھماتی موٹے سرخ غبارہ سے گال پھلاتے ٹکیاں تاتے سکینہ بی سے باکسنگ لڑ رہی تھی۔ وہ اتنی شوخ اور چنچل تھی کہ کبھی کبھی امّی فکرمند ہو جاتیں اور اس کے سوالات امّی کو بولا دیتے

"لیکن امی اللہ میاں نے جب ننھے کو پھینکا تو اسے چوٹ کیوں نہیں آئی؟

"کیسے پھینکا ہوگا بھلا۔؟"

امی کمرہ تو بند تھا۔ اسے فوراً یاد آجاتا۔

پھر آپ کیوں بیمار ہوگئیں تھیں جی۔" کچھ اس طرح کہنی جیسے پکڑ لیا چور۔

اور امی کے پسینے چھوٹ جاتے۔ پھر ایک بار وہ چاول بینتی ہوئی سکینہ بی کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ اچھی سکینہ ایک بات تمہیں بتائیں۔ منا آیا ہے۔ امی تو ہم سے بولنے سے رہیں۔ سکینہ بی بڑے مزے کی بات ہے۔ جب بلی کا پیٹ پھول جاتا ہے تو وہ بچے دیتی ہے۔"

"توبہ ہے بی بی ایسی باتیں نہیں کرتے۔ ابا میاں ماریں گے۔" اور لبشی بی جھنجلا کر بینے ہوئے چاولوں پہ ہاتھ مارتی یہ جا وہ جا۔

ایک دن تو اس نے حد ہی کر دی۔ شام کے وقت خاندان کے سبھی افراد جمع ہوتے اور یہ ان کے درمیان مینا کی طرح چہکتی پھرا کرتی تھی۔ سب باری باری بلا کر پیار کرتے۔ اور امی کو اپنے پیروں تلے زمین کھسکتی معلوم ہوتی۔ امی نے لاکھا می پن برتا۔ ڈانٹتے سمجھاتے تنگ آگیئں تو جب کہیں جا کر بڑوں کے سامنے چپ رہنا سیکھا۔ اسکول بھی بٹھا دیا گیا لیکن وہاں تو ہر ایک ستم ڈھانے پر تلا بیٹھا تھا۔ اسکول کی آپا جان بھی ایک ہی تھیں۔ ہر وقت کی ڈانٹ بی بی جو سمجھ میں نہ آئے پوچھ لیا کریں۔ سوالات کرنے کی عادت ڈالیں۔ ہم سے امی سے ابو سے جس سے چاہیں اور اسی بات سے امی کو سخت چڑ تھی۔ ادھر اس نے منہ کھولا اور ادھر امی نے سہم کر اسے گھورا۔ اسی طرح وہ چھٹے درجے میں آپہنچی تھی اور بم کی طرح سوال کرنے کی عادت نہ گئی تھی۔ اسلامیات کی کتاب میں بیسیوں بار "زنا کا فعل"، اس نے پڑھا تھا۔ آپا جان سے پوچھا تو گول مول کر گئیں کھانا کھانے میں ابا میاں سے پوچھ بیٹھی۔ "ابا جان یہ زنا کا فعل کیا ہوتا ہے۔ اچھے بھلے

نوالہ چباتے ابا میاں کے وہ پھندا لگا ہے کہ پانی کے لئے خود اٹھ کھڑے ہوئے۔ حالانکہ پانی کا بھرا گلاس سامنے ہی رکھا تھا اور پلٹے ہی نہیں۔ امی نے ادھر پسلی میں ایسی کہنی جمائی کہ اس کے حلق میں بجائے نوالوں کے بہت سے پتھر لڑھکے۔ کچھ بھی ہو لڑکیوں کا سدھانا بے حد آسان ہے۔ بزرگوں کی نصیحتیں، بڑھیوں کی روک ٹوک۔ امی کی ڈانٹ ڈپٹ، باجی کے طنز، رشتہ داروں اور ہمسایوں کے طعنے تشنے۔ آہستہ آہستہ لڑکیوں کو ڈھال ہی لیتے ہیں۔ فولاد جیسی چیز کو توڑ پھوڑ کر حسب منشا چیزیں بنالی جاتی ہیں تو پھر گوشت پوست کے اس نازک سے وجود کا کیا ہے جس طرح چاہا موڑ لیا۔

بشریٰ بی بی جب آٹھویں درجہ میں گئیں تو بیک وقت بہت سی تبدیلیوں کے ساتھ سکینہ بی بی نے یہ بھی دیکھا کہ اس کا پڑھائی میں اب دل کم ہی لگتا ہے۔ جب دیکھو نئے فیشن کی قمیض قطع ہو رہی ہے۔ گھر کو نئے سرے سے سجایا جا رہا ہے۔ پرانے صوفہ سیٹ کے نئے کپڑے سل رہے ہیں۔ میز پوش اور ٹی کوزی پر نازک بیلیں کاڑھی جا رہی ہیں۔ پھولوں کے گلدستے بنائے جا رہے ہیں۔ اور چاندنی راتوں میں پھولوں کی کیاریوں کے گرد منڈلاتی ہوئی تتلیوں کا سراغ لگایا جا رہا ہے۔ امی نے کئی بار سمجھایا پڑھ لکھ لو ابھی بہت دن پڑے ہیں ان کاموں میں۔ لیکن پھر سوچ کر خود خاموش ہو جاتیں۔ آخر لڑکیوں کو یہی کچھ کرنا ہوتا ہے۔ اور ان کی بٹیا ہر چیز میں طاق ہوتی جا رہی تھی۔ ہر آنے جانے والا جہاں فیشن زدہ ہونے کا طعنہ دیتا وہاں سلیقہ اور نفاست سے متاثر ہوئے بغیر بھی نہ رہ سکتا۔ بشریٰ بیگم کی تو ہر بات ہی نرالی تھی۔ نہ جانے کیسے کیسے خواب دیکھنا شروع کر دیئے تھے۔ پیارا سا گھر ہوگا۔ جسے وہ پھولوں ہی پھولوں سے سجا دے گی۔ ہر رنگ کا گلاب تو ضرور ہوگا اور گیٹ پر بوگن ویلا کی رنگین جھکی جھکی ڈالیاں بھی ہوں گی۔ تھکا ہارا اس کا دولہا گھر آئے گا تو وہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہے گی۔ واہ جی۔ یہ بھی کوئی وقت ہوا آنے کا۔ کبھی کبھی پیارا سا گول مٹول کلکاریاں مارتا

ہوا بچہ ہمک کر اس کی گود میں آجاتا اور اس کی ناک اور آنکھ میں انگلیاں ٹھونسنے لگتا۔
ہائے اللہ شکر ہے ہمارے خواب ہمیں کو نظر آتے ہیں اگر دوسروں کو نظر آجاتے تو نہ جانے کیا ہوتا۔ اور وہ یوں ہی سرخ ہو جاتی لیکن اس پگلی کو کیا معلوم کہ بیٹیوں کے سنہری خواب ان کی آنکھوں میں گھس کر ان کی راتوں کی نیند اڑا لے جاتے ہیں۔ پھر جب لڑکی اچھی ہو والدین کی اکلوتی اولاد ہو اور لاکھوں کی وارث ہو تو کون ہے جو ٹوٹ نہ گرے گا۔ بڑی ممانی ان دنوں جی جان سے واری نیاری ہوتی تھیں۔ اصغر اس کا ماموں زاد بھائی۔ یوں تو اس کا قد بھی اونچا تھا۔ چوڑا سینہ، چہرہ کندن کی طرح دمکتا۔ لیکن چھوٹی چھوٹی تیز آنکھیں کچھ اس طرح دیکھا کرتیں جیسے چھیدتی ہوئی پار ہوئی جا رہی ہوں۔ یہ ٹٹولتی ہوئیں ٹیڑھی چھچھوری نظریں کچھ ایسی تھیں کہ بشریٰ ان کے سامنے ٹھہر ہی نہ سکتی تھی۔

بڑے ماموں کی خوب بڑی سی کوٹھی تھی جس میں ہرے بھرے گھاس کے وسیع قطعے تھے۔ رنگ برنگ پھولوں کی کیاریاں تھیں۔ آم، کیلا، جامن اور بادام کے خوبصورت گھنے پیڑ تھے۔ پھر ہنستی کھلکھلاتی خوش مزاج بہت سی ماموں زاد بہنیں جب بھی ممانی بشریٰ کو ساتھ لے جانے کے لئے کہتیں کچھ نہ کچھ ہو جاتا۔ عید کی رات بھی ممانی نے منتوں سے امی کو راضی کیا۔ اسی دوران ابو میاں پانی پینے کے لئے اٹھے اور دوسرے ہی لمحے لڑکھڑا کر گر پڑے پھر اٹھے ہی نہیں۔

اچھا تو دل اتنی شدت سے بھی دکھا کرتا ہے۔ ہم سب کس قدر معمولی ہیں لیکن پھر بھی بڑے بڑے منصوبے بنانے سے باز نہیں آتے ہیں۔ اس نے دعا مانگی اے اللہ مجھے ہر اچھی چیز سے نفرت ہو جائے تاکہ اس کی جدائی کا غم مجھے اٹھانا نہ پڑے۔

کہاں تو بشریٰ ممانی کی منتوں اور خوشامدوں سے وہاں نہ جا سکی تھی اور کہاں اسے امی کے ساتھ مستقل وہیں رہنا پڑ گیا۔ جب مصیبت آتی ہے غم ٹوٹتا ہے تو یہی لگتا ہے کہ اب نہ جئیں گے لیکن جب سورج ڈوب جاتا ہے۔ شام کی تاریکی پھیل جاتی ہے تو چاند تارے

نئی دنیا آباد کر دیتے ہیں اور پھر دوسرے دن سورج اسی طرح چمکتا دمکتا طلوع ہو جاتا ہے۔ لبنٰی بھی بہت سی راتوں گڑگڑا کر اللہ میاں سے شکوے شکایت کرتی رہی تھی۔ لیکن آہستہ آہستہ اس کی شوخی و شرارت اور مشغلے لوٹ آئے۔ اسکول سے آتے ہی بدستور نازک بیلیں کاڑھی جاتیں۔ پھول چُنے جاتے۔ غروب آفتاب کا منظر اور تتلیاں پینٹ کرنے کے لیے مقابلے ہوتے اور برش تیزی سے کینوس پر پھسلنے لگتا۔

ایک رات بھیگی بھیگی چاندنی میں گھلی ہوئی موتیا کی مہک نے اسے جھنجوڑا تو بھلا ماموں جان کی پھولوں سے لدی پھندی کوٹھی میں چاندنی کا نجانے کیا نظارہ ہوتا ہوگا اور وہ سب کو سوتا دیکھ کر دبے پاؤں باہر نکل آئی۔ جوہی اور چنبیلی کی مہک سے بوجھل فضا آم اور جامن کے گھنے درختوں اور پھولوں پر گرتی ہوئی چاندنی۔ سرسراتے پتوں کی گنگناہٹ۔ سنگ مرمر کا سفید فوارہ جیسے شگفتہ کنول۔ اسے یوں لگا جیسے خواب دیکھ رہی ہو۔ اس نے جھک کر بڑے سے گلاب کے پھول کو چھونا چاہا۔

"پھول پھول پر جھکا کتنا دلفریب معلوم ہوتا ہے۔" اسی لمحے کسی نے اپنا بھاری ہاتھ اس کی کمر میں حمائل کر دیا۔ ایک دم بہت سی لہریں اس کے جسم میں سنسنا گئیں۔ سارا خون رخساروں اور کنپٹیوں پر جیسے منجمد ہو گیا۔ اس نے تڑپ کر علیحدہ ہونا چاہا۔ ایسے وقت اور ایسے سماں میں ایک کمی تھی۔ سو وہ بھی پوری ہو گئی۔ حسین ساتھی۔ وہ شکاری کے ہاتھوں میں کبوتر کی طرح پھڑپھڑا کر رہ گئی۔ اور پھر کٹی پتنگ کی طرح نیچے آ رہی۔

امی نے جب راتوں رات دیوانوں کی طرح پلو پسار پسار کر کوسنوں اور صلواتوں کی تابڑ توڑ بارش کر دی تو ماموں تو دم سادھے پڑے رہے لیکن ممانی کو ایک دم غصہ آ گیا۔ بیوہ نند وہ بھی بھائی کے کندھوں پر یوں سوار منہ بھر بھر کے سگے بھائی کی اولادوں کو کوسے۔ رکل کلاں خاندان میں نہ جانے کیا کیا اٹھا دیں اس عمر میں لڑکوں

سے ایسی شرارتیں ہو ہی جاتی ہیں۔ لڑکی کون سی ایسی پارسا ہے۔ ہر وقت ننگی بانہیں اور کولہے مٹکاتی پھرتی ہے۔ پھر آدھی رات چاندنی میں گھومنے کا کیا مطلب ہے۔ بھرے پرے گھر میں نوکر چاکر سب ہی ہیں نہ جانے کون۔ امی ممانی کے مقابلے میں بے حد کمزور ہو تم ایک عورت ہو اور ایک جوان لڑکی کی ماں ہو اور ہر گھڑی اس قدر کٹھن تھی کہ امی کے ہونٹ سل گئے۔

یہ بات ماموں زاد بہنوں سے ان کی سہیلیوں تک، سہیلیوں سے ماؤں تک آگ کی طرح تو نہیں لیکن نرم رو ندی میں لڑھکتی لاش کی طرح ضرور پہنچ گئی۔ بات بھی تو ایسی تھی نا۔

اس وقت حالانکہ اسے مر جانا چاہیئے تھا۔ یہی چھت سے گر کر یا فوارے سے سر پھوڑ کر جیسا کہ اس سے بیشتر لڑکیاں کنوئیں میں چھلانگ لگا دیا کرتی تھیں لیکن پتہ نہیں وہ کیوں روتی رہی تھی۔ اس کا دل کسی چیز میں نہ لگتا تھا اور وہ خاموشی سے مرنے کی دعائیں مانگا کرتی۔ ممانی اور ماموں زاد بہنیں بڑی عجیب سی نظروں سے دیکھنے لگی تھیں۔ جیسے نالی میں سڑی ہوئی کتیا ہو۔ جہاں جاتی کھسر پھسر ہونے لگتی۔ نوکر طنزیہ نظروں سے دیکھتے تھے۔ وہ آسمانوں کی بلندیوں سے گر کر کوڑا کرکٹ کے ڈھیر پر آ گری تھی۔

وقت کی پرکاریوں سے غم سے مسخ شدہ چہرے بھلا کیسے چھپ سکتے ہیں۔ نہ جانے کیوں کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بھیانک اور خطرناک ترین چیزوں سے ہمیں پیار ہو جاتا ہے۔ اور یہ شاید اس وقت ہوتا ہے جب کسی کی اپنی دنیا بالکل تباہ و برباد ہو جاتی ہے وہی موت جو اباجان کے انتقال پر اتنی خوف ناک اور اس قدر ہولناک اور درد انگیز معلوم ہوئی تھی۔ اب اسے بہت ہی اچھی معلوم ہوتی تھی مگر اس کے باوجود وہ اسے گلے نہ لگا سکی تو پھر ہوا یوں کہ اس نے اپنی زندگی کے گھوڑے کی باگیں تھام لیں اور کس کر

کر ایڑ لگائی۔ کہ سب دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔ بشریٰ بیگم کا انجانی باتوں پر دھڑکتا دل کٹ کٹا کر ختم ہو گیا۔ سنہری سپنوں والا تھکا ماندہ جیون ساتھی نہ جانے کہاں جا چھپا چھوٹے سے لدے پھندے پھولوں والے گھر پر تابڑ توڑ گولے برسے۔ ہمکتا ہوا گول مٹول بچہ دفن ہو گیا۔ وہ اب کتابیں پڑھتی تھیں اور کبھی کبھی بھیانک خواب دیکھ کر چیختی اور اماں سے لپٹ جاتی۔

تو مس رؤف اب تمہیں کیا کرنا چاہیئے۔ تم سمجھی تھیں۔ شاید بشریٰ بیگم کو مٹا کر تم خوش رہ سکو گی۔ تم بے حد کمزور ہو کچھ بھی بن جاؤ۔ تم عورت ہو اور تمہاری یہی سزا ہے۔ اس نے انتہائی بے دلی سے کھڑکی میں سے جھانکتے ہوئے چاند کو دیکھا جو بالکل اس کے سامنے آگیا تھا۔

بہت سے بے رونق دن، اداس شامیں اور سسکیوں میں ڈوبی ہوئی راتیں گزر گئیں۔ نت نئے ورائٹی پروگرام ہوتے۔ فیئر ویل پارٹیز گیم کے مقابلے ہوتے ہیے لڑکے لڑکیوں کے تبصرے سب یوں ہوتا رہا ہے جیسے ٹیپ ریکارڈر لگا رہ جائے۔ ریگستان میں کہیں بارش کا چھینٹا پڑ گیا اور امی کے کوئی دور کے بھانجے وکیل صاحب برساتی بینڈک کی طرح وارد ہو گئے جن کی جوان سال بیوی کا ابھی کفن بھی میلا نہیں ہوا تھا کہ خالہ نے اس کے گھر کے طواف شروع کر دیئے۔ تو مس رؤف اسپ زندگانی کی باگ ایک بار پھر تھام لو۔ اپنی ماں کی بوڑھی آنکھوں کی خاطر جواب تک بیٹی کے پھول کھلنے کے لئے کھلی ہوئی تھیں اور اس طرح شاید دنیا والوں کے منہ بند ہو جائیں۔ زندگی اس زنجیر کا نام ہے جس کی ہر کڑی لال انگارہ کر کے ہتھوڑے سے پیٹ کر بنائی جاتی ہے اور پھر ہر ایک کو زندگی کی اس زنجیر میں باندھ دیا گیا ہے۔ اس نے بانیؔ فانی بند کر کے ایک طرف رکھی اور آہستگی سے ماں کی گود میں سر رکھ دیا۔ اماں۔ اماں مجھے منظور ہے۔ جو آپ نے کہا تھا اور امی نے اپنے تپتے تلیوں

کے سے کانپتے ہاتھوں سے اس کے رخسار تھپتھپائے اور پیشانی چوم لی۔

ایک بار پھر مس رؤف کے اندر کی بشریٰ بیگم جاگ اٹھی۔ وہ میرا شوہر ہوگا۔ میرے دکھ سکھ کا ساتھی ہوگا۔ میں اسے بہت سا پیار کروں گی اور اس کے بچوں کو اپنا سمجھ کر پالوں گی۔

امی نے برسوں کی سمیٹی ہوئی چیزیں نکلوانی شروع کر دیں۔ ان کی بوڑھی کانپتی ٹانگیں پھرکی کی طرح گھومنے لگیں۔ خوشی سے دمکتی آنکھیں کرن گوٹہ سلمہ ستارے میں کھب کر رہ گئیں۔ عورت ماں ہو۔ بیوی ہو۔ بیٹی ہو محبت چاہتی ہے۔ محبت کرتی ہے اور اسی پر مرمٹتی ہے۔ جب وہ دلہن بنی تو اس کے پاکیزہ خیالات کا سارا تقدس اس کی سانولی صورت میں سمٹ آیا۔ وکیل صاحب کا گھر کون سا دور تھا۔ ان کی دہلیز پر قدم رکھنے میں پانچ منٹ کی بھی دیر نہ لگی۔

دلہن کے بٹھاتے ہی ریں ریں پیں پیں کر کے ناک سڑاتے بچے دلہن امی دلہن امی کہتے پاس بیٹھ گئے اور کالج کے چند لڑکے اور لڑکیاں جو بن بلائے آنکلے تھے اس طرح سہمے بیٹھے تھے جیسے فلم کا انتہائی بھیانک سین دیکھ رہے ہوں۔ گھڑی کی ٹک ٹک کے ساتھ بشریٰ کا وجود بجتا رہا۔ رات گئے ساس بچوں کو ہٹانے لگیں تو وکیل صاحب بولے۔ اماں کہاں لئے جاتی ہو سب بچوں کو یہیں پڑے رہنے دو۔ نیلی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ دل نہ جانے کہاں نیچے اترتا چلا گیا۔ انہوں نے پھر اماں کے سامنے ہی گھونگھٹ الٹ دیا۔

"ہماری بیگم ہے تو بڑی پیاری"! "ہماری بشی ہے تو بڑی پیاری۔" جیسے ابو میاں بولے۔

"اچھا تو یوں کرو، لائٹ گل کر دو۔ بڑی دیر ہوگئی۔ اچھی بشی بے بی سو جاؤ اتنی رات گئے جاگا نہیں کرتے۔" ابو پھر بولے۔

کالج کے لئے نئی خبر مس رؤف کی شادی تھی اور اس پر تبصرے کے لئے پورا مہینہ کافی تھا۔ اور سب بے چینی سے مس رونا کا انتظار کر رہے تھے۔ شاہنواز میاں دل چھوٹا نہ کرو۔ جوانی دیوانی ہوتی ہے۔ بزرگ کہتے ہیں۔ محبت وصال کا نام نہیں بلکہ محبت میں وصال کی خواہش خود غرضی ہے نہیں اگر مس رؤف سے بے پناہ محبت تو ان کے خلوص اور صداقت علم کو دوسروں تک پہنچاؤ اور یہی تمہارا وصال ہے۔ شاہنواز بالکل سنکی ہو گیا ہے۔ سب کہتے۔

بشریٰ بیگم ہماری قمیص میں بٹن نہیں لگے اب تک۔ بے بی نے آج دن بھر نہیں پڑھا منے میاں میلے چیکٹ بلی کے بچوں کو لادے پھر رہے ہیں۔ زلفی نے اب تک دودھ نہیں پیا۔ بشریٰ بیگم کی جھکی ہوئی نظریں کیلنڈر پر جم گئیں۔ تیسرا دن تھا شادی کو۔

بشریٰ بیگم تم سروس نہیں کر سکتیں۔ گھر کون سنبھالے گا۔ ہفتہ ہو چلا تھا۔

بشریٰ بیگم مجھے قطعی پسند نہیں کہ تم سروس کرو۔ جب کہ تمہارا شوہر اس کی اجازت نہیں دیتا۔ دو مہینے ہو چلے تھے۔

”اور اگر اپنی زندگی کے لئے۔ جو کہ خدا کی دی ہوئی امانت ہے اور اس کی حفاظت میرا فرض ہے۔ اگر میں آپ کی اجازت کے بغیر بھی کچھ کر لوں تو۔“ اس نے ہمت کر کے نہ جانے کیسے کہہ ڈالا۔

وہی جو تم اب تک کرتی چلی آرہی تھیں۔ اور میں نے تمہیں باعزت زندگی۔

اس سے پہلے کہ وہ جملہ پورا کرتا۔ وہ بپھری ہوئی شیرنی کی طرح اٹھی اور پاس ہی رکھا ہوا مصالحہ پیسنے والا بٹہ پوری قوت سے اپنے شوہر پر دے مارا۔

پھر دلخراش چیخوں میں خون کے فواروں میں قہقہے گونجے۔ وہ قہقہے جو زندگی بھر دبے رہے۔ سسکتے رہے۔ تڑپتے اور مچلتے رہے۔ اب بغیر کسی رکاوٹ کے سارے گھر میں گونج رہے تھے اور دنیا کے نظام میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ سیپ ۱۹۶۶ء

بچّہ اور پیار

نصرت جبیں ایک عرصے سے زمان خان کی بے ڈھنگی حرکتوں سے سخت عاجز تھیں
اس نے نصرت جبیں کے نظریات کے پرخچے اڑا دیئے تھے۔ وہ خود بھی تو اس قدر ماڈرن
ہوتے ہوئے اتنی قدیم تھیں کہ ان پہ الٹرا ماڈرن ہونے کا گمان ہوتا تھا۔ انہیں یہی
اعتراض تھا کہ اس کا نام زمان خان کیوں ہے۔ حالانکہ وہ خان تو بالکل ہی نہیں
اور زمان بھی نہیں۔ اتنے دھان پان لڑکے کا اس قدر غراتا ہوا نام کیسے ہوسکتا
ہے۔ لہذا نصرت جبیں نے اس کا نام بدل کر صورت حال پہ قالو پا لینا چاہا پھر شومئی
قسمت نئے نوکروں کا انٹرویو لینے پر بیگم شمس جیسی خاتون مامور تھیں جن کی قوت
سماعت کا یہ حال تھا کہ وہ خود اپنی آواز سننے کے لئے ترس گئی تھیں۔ لہذا نصرت جبیں
کی غیر موجودگی میں جتنے بھی نوکر آئے سر پہ پیر رکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ بیگم شمس نے اپنا
چشمہ اتارا اور بارعب آواز میں یوں گویا ہوئیں۔

''نام کیا ہے تمہارا؟''

" زمان خان۔"

" ایں زنانہ پان۔" وہ بے حد بولائیں، حالانکہ معلوم تھا اچھا خاصا کہ مبتلائے سماعت ہیں۔ اگر چپ ہی رہ جاتیں تو کیا حرج تھا۔

"نہیں جناب زمان خان۔" وہ ایک آنکھ بند کر کے مسکرایا۔

"ارے لو موا بالشت بھر کا لونڈا اور کہہ رہا ہے مجھے "نہیں جان جوان" دور ہو جا میری نظروں سے اور اپنے ہوتو سوتوں کو بتا "جان جوان"۔"

کہ نصرت جبیں نے بر وقت بیچ کر معاملہ رفع دفع کرا دیا۔

زمان خان آٹھ نو برس کا دبلا پتلا لاغر سا کالا بھجنگ لڑکا تھا۔ اس پر طرہ یہ کہ بات کرتے ہیں ایک آنکھ بند کر لیتا تھا۔ ظاہر ہے کہ بیگم شمس کہاں تک برداشت کرتیں، وہ بے چاری ٹھیک سے نام ہی نہ سمجھ پا رہی تھیں۔

"تم کسی طرح بھی زمان خان نہیں لگتے۔ لہٰذا اے میاں زمان خان ہم ویسے بھی طویل ترین ناموں کے ستائے ہوئے ہیں کیونکہ لڑکیوں کے اسکول میں پڑھاتے ہیں لہٰذا ہم تمہیں چھوٹے سے نام سے پکاریں گے جیسے "پلو"۔"

پلو ایک آنکھ دبا کر مسکرایا۔ جیسے کہہ رہا ہو کہ بڑے ہی کہہ لیجئے۔ اتنی کسر نفسی کیسی۔

اس طرح سے پلو باوجود بیگم شمس کی نارضامندی کے رکھ لیا گیا۔

نوکروں کی اہمیت تو نصرت جبیں ہی جانتی تھیں۔ جو ان دنوں زنانہ رسالے میں نوکروں کی نفسیات پر مضمون لکھنا چاہ رہی تھیں لیکن پلو اس قدر عجیب و غریب لڑکا تھا کہ نصرت جبیں کا مضمون اس کی نئی نئی حرکات سے غلط ہونے لگا تھا اور نئے مفروضات کا ستیاناس ہو گیا تھا۔

پلو کو اپنی صفائی اور کپڑوں کی سے ذرا بھی دلچسپی نہ تھی لہٰذا بدبو کے بھبکے ہر وقت ناکیں سڑائے ڈالتے تھے۔ البتہ بال سنوارنے کا شوق انتہا تک تھا جس کے لئے وہ

وہ اکثر فاروق احمد کے خالص چنبیلی کے تیل کو پانی میں ملاکر سر میں انڈیل لیتا تھا اور بالوں کا یوں پلستر جماتا گویا ہفتوں بال بیکا نہ ہوگا۔

کھانوں میں دال اور مرغی کو نہ منہ لگاتا۔ بظاہر بھوکا رہ لیتا۔ مگر موقع پاتے ہی دودھ کی بالائی اتار لیتا یا انڈا اڑا لیتا۔ اس کے علاوہ وقتاً فوقتاً اگر کھانے کو جی چاہے تو بڑی بی کی اجوائن کے ساتھ رکھا ہوا گڑ صاف کر جاتا تھا۔ اس پر وہ ایسی گھناؤنی صلواتیں سنواتیں کہ بے غیرت تک دہل جائیں مگر وہ یوں کھِل کھلا پڑتا جیسے کوئی گدگدی کر رہا ہو۔

چھوٹے بچوں پر وہ جان چھڑکتا تھا۔ ایسی ایسی آوازیں نکالتا اور شکلیں بناتا کہ بچے بجائے خوف زدہ ہونے کے بے اختیار ہنس پڑتے اور اس کی طرف لپک کر دوڑ جاتے۔

بھابی کے بچّے منو اور بالی دو ہی دنوں میں ایسے ہل گئے تھے کہ نہ صرف نصرت جبیں بلکہ بھابی تک کو غصہ آنے لگا تھا۔ ایک بار جب ہر طرح کے لالچ دینے کے باوجود بھی منا ان کی طرف نہ آیا تو بھابی کے پتنگے لگ گئے۔

”اتارو اسے نیچے، فضول میں بگاڑ کر رکھ دوگے میرے بچوں کو۔ ہر وقت خود پر سوار رکھوگے تو جو ذرا سا چلنا سیکھا ہے وہ بھی بھول جائے گا۔“

اس نے ویسی ہی ہنسی ہنستے ہوئے منّے کو اتار دیا۔ پر منّے نے مچل مچل کر سارا گھر سر پر اٹھا لیا اور ساتھ ہی بالی بھی لگ گئیں تو بھابی کو ہتھیار ڈالنے پڑے۔

اور نصرت جبیں کو جو رومال ہاتھ میں تھامے دھلانے کے لئے کھڑی تھیں۔ ڈانٹ کر کہنا پڑا۔

”جانا لائق لے جا ان کو باہر۔“

دن بھر ویسے بھی پلّو کا بندھا ہوا خاص کام تو تھا نہیں۔ بس یہی آگ جلاکر

چائے کا پانی رکھ دینا۔ بازار سے چھوٹا موٹا سودا سلف لا دینا۔ نصیر احمد کے پیر دبا دینا یا بیگم شمس کے سر پہ چمپی کرنا۔ نصرت جبیں نئے سرے سے مضمون لکھتیں اور کچھ دنوں کے بعد پرزے پرزے کر کے اڑا دیتیں۔ وہ برابر ان کے مفروضات پر گولہ باری کرتا رہا۔ باوجود دو ماہ کی سخت تربیت کے وہ روزِ اوّل کی طرح جنگلی تھا۔

ایک دن وہ نصرت جبیں کی طبیعت کے عین خلاف چار آنے کا ابتدائی قاعدہ خرید لایا۔

"نصرت جبیں تم ہم کو پڑھائے گا۔"

"یہ پلو میاں مجھے نصرت جبیں کہہ رہے ہیں دو دو قدم ہٹ کر بی بی جی بولا کر نالائق۔ ہاں پڑھا دوں گی۔"

فرصت کے وقت وہ اب سبق دہراتا رہتا۔ پاکستان ہمارا ملک ہے۔ ہمیں اس سے پیار ہے۔" پھر اچک کر منے کو اٹھا لیتا اور پیار کرنے لگتا۔

دوپہر میں نصیر احمد کے پیر دباتا تو کبھی بالی اور منے کو اشارے سے اپنے پاس بلا لیتا۔ ویسی ہی شکلیں بنانے لگتا۔ کبھی رونے کی۔ کبھی ہنسنے کی۔ نصیر احمد اس کے ہاتھوں کے غیر متوازن دباؤ سے سمجھ جاتے کہ وہ کیا کر رہا ہے مگر وہ چپکے سے پڑے رہتے۔ پھر وہ آوازیں بھی نکالنے لگتا اور آخر کار نصیر احمد کو کہنا پڑتا۔

"لے جا ان کو باہر مردود۔"

ادھر بھابی گھنٹوں کمرہ ٹھیک کر کے بیٹھی بچوں کا انتظار کرتی رہتیں۔ میٹھے میٹھے حربے استعمال کرتیں مگر وہ قریب ہی نہ پھٹکتے اور وہ انگاروں پر لوٹ جاتیں۔ وہ بچے ہر وقت ہنستے رہتے تھے کہ سب تنگ آ گئے تھے۔

"تم میرے بچوں کو اتنا نہ ہنسایا کرو جبھی نظر لگ جائے گی۔"

اور ایک بار واقعی نظر لگ گئی۔ پلّو نے محلے کی عورتوں کے سامنے اس قدر ہنسایا کہ سب ہی نے سراہا اور شام ہوتے ہی وہ پڑ گئے۔ بھابی نے جو چھوا تو جیسے آگ پر ہاتھ پڑ گیا ہو۔ بھابی سخت پریشان تھیں اور پلّو کو سب کھاجانے والی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

اس کے بعد سے وہ پلّو کو ان کے نزدیک زیادہ نہ آنے دیتے۔ خود ہی رنگ برنگی تصویروں، ٹیڑھی میڑھی شکلوں اور بھونڈی گنگناہٹ سے ان کا دل بہلانے کی کوشش کرتیں۔

مگر پلّو بھی بلا کا ضدی تھا بھابھی کی رکھائی، نصرت جبیں کی ڈانٹ ڈپٹ اور بیگم شمس کی دھمکیوں کا اس پر ذرا بھی اثر نہ ہوتا تھا۔ کھانے کی دھمکی یوں فضول تھی کہ اسے اس کے متبادل طریقے معلوم تھے۔ تنخواہ چچا کے ہاتھ میں رہتی تھی اور نکال دینے کو محض مذاق خیال کرتا تھا۔

"تم ہم کو کدھر بھی پھینکو ہم کتے کے مافق کر ڈھونڈ کے ادھر ہی آئے گا۔"

لہٰذا وہ موقع ملتے ہی منے اور بالی کو لے جاتا اور ان کے ساتھ کھیلتا رہتا۔

پھر کبھی کبھی ایسے ہی چھوٹے چھوٹے واقعات ان کی رائے بدل دیتے۔ جیسے ایک رات نصرت جبیں اور بھابی بچوں کو سوتا چھوڑ کر فلم دیکھنے گئیں۔ آتے ہیں گاڑی خراب ہو گئی۔ جب گھر واپس آئیں تو بارہ ایک بجے کا عمل ہو گا۔ دیکھا تو بالی پلّو کے زانو پر سر رکھے سو رہی تھی اور منّا اس کی گود میں تھا۔ پلّو بے طرح نیند میں جھول رہا تھا۔ ہر بار اونگھنے پر اس کا سر دیوار سے ٹکراتا جس پر وہ آنکھیں کھول کر دروازے کی طرف دیکھ لیتا پھر منّے اور بالی پر نظر ڈال کر اونگھنے لگتا اور اس کا سر لہرا کر دیوار سے جا ٹکراتا۔

صبح نصرت جبیں نے بڑے موڈ میں آکر پلّو سے پوچھ ڈالا۔

"پلّو۔ یہاں تمہارے بھی چھوٹے بہن بھائی ہوں گے۔"

"نہیں ہمارا کوئی نہیں ہے۔"

"ماں۔ ماں تو ہوگی۔"

"نہیں۔ ہمارا ماں بھی . . . اس نے زوردار گالی بکی۔ ادھر باپ مرا ادھر وہ ہمارے چچا کے ساتھ بھاگ گیا۔

"چھی چھی۔ گالی بکتے ہو۔ یہی پڑھتے ہو قاعدہ میں۔ ہیں۔

"ہم تو صرف گالی بکتا ہے۔ پر وہ تو گالی کرتا ہے۔" وہ سرخ ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں شعلے ہی شعلے تھے۔

نصرت جبیں گنگ کھڑی اسے دیکھتی رہیں۔ کوئی جواب ہی نہ سوجھا۔ ان دنوں وہ نہایت اچھوتا سا مضمون لکھنے والی تھیں۔

انسانی زندگی میں تبدیلیاں کبھی کبھی خون کے آنسو رلاتی ہیں۔ ایسے میں شدت سے جی چاہتا ہے کہ ایک ہی سا وقت جم کر رہ جائے۔

اور ایک دن ایسی ہی تبدیلی بھابی کے اچانک میکے چلے جانے پر واقع ہوئی۔ دوسرے لمحے گھر سونا ہو گیا۔ پلّو کا شریر ہمہ وقت ہنستا ہوا چہرہ یوں کملا گیا جیسے پھولوں کو لُو لگ جائے۔ وہ ایک بار پھر نصرت جبیں کی توقع کے خلاف بے حد بدل گیا۔ انہیں اس بات کا یقین تھا کہ یہ لڑکا کبھی اس قدر اداس نہیں ہو سکتا۔

پلّو کا صبح کا ناشتہ یونہی رکھا رہا۔

فاروق احمد کا کمرہ جھاڑنا شروع کیا تو نہ جانے کب تک جھاڑتا ہی رہا۔ ان کے میلے کپڑے اور کتابیں جوں کی توں بکھری پڑی رہیں۔ کاغذ کے پرزے جگہ بہ جگہ پھیل گئے۔

بیگم شمس کی چمپی کی تو وہ بھی یونہی سہی۔ وہ چلّاتی رہیں۔ موئے ہاتھ کہاں گئے تیرے! طاقت ہی نہیں رہی۔ اور لیو . . . چمپی کر رہا ہے یا بال نوچ رہا ہے میرے

میں نے کیا قصور کیا ہے تیرا۔ کس دن کا بدلہ اُتار رہا ہے۔ جا دفعان ہو جا۔"

نصیر احمد کے پیر دبانے بیٹھا تو وہ بھی بولے۔ "یہ پیر دبا رہا ہے یا سہلا رہا ہے میاں یہ وہی پیر ہیں کوئی ادھار تو نہیں مانگ لایا ہیں کسی سے۔ کیوں سوتیلوں کا سا سلوک کر رہا ہے۔"

نصرت جبیں کی کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ لڑکا ہے یا ننھا سا آٹ۔ اتنا سا لڑکا اور کیسی ماننا لے کر پیدا ہوا ہے۔"

فاروق احمد بھی ایسی باتوں پہ اُتر آئے۔ "میڈیکل چیک اپ کراؤ۔ دنیا میں ویسے بھی بڑی گڑبڑ ہے۔ ماننا والی نشانی کوئی بہتر شگون نہیں۔"

سب نے باری باری ڈانٹا۔ نکال دینے کی ایک بار پھر دھمکیاں دیں۔ جس پر اس نے دوپہر ذرا سا کھانا کھایا۔ مگر وہ مرے مرے انداز میں ادھورے کام کرتا رہا۔

نصرت جبیں بے حد تنگ آچکی تھیں۔ اب وہ اس سلسلہ میں کچھ کتابیں پڑھنے کا ارادہ رکھتی تھیں۔

دوسرے دن سب انتہائی نرمی سے پیش آئے۔

بیگم شمس تک نے پیار سے سمجھایا۔ ان کا ذرا سا پیار بڑے بڑوں کے تنی ہوئی گردنیں جھکا دیتا تھا مگر اس کے انداز میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔

نصیر احمد نے سر پر ہاتھ پھیر کر تسلی دی، مگر وہ چٹان کی طرح جما رہا۔

نصرت جبیں نے مضمون والی کاپی پھاڑ کر پھینک ڈالی۔ یہ سب فضول باتیں ہیں ہم سب بے حد عجیب و غریب ہیں۔ اگر اتنے سیدھے سادے ہوتے تو دنیا اتنی بے ڈھنگی کیوں ہوتی۔ انہوں نے ایسے مضمون لکھنے کا خیال دل سے نکال پھینکا۔

سب ہی بلو پر کڑھتے رہے اور وہ جوں کا توں رہا۔

کچھ دنوں بعد ایک صبح جب بیگم شمس چلا چلا کر اپنا چشمہ ڈھونڈھ رہی تھیں

اور نصیر احمد اخبار لئے بیٹھے تھے۔

نصرت جبیں باورچی خانے میں ناشتہ تیار کر رہی تھیں کہ صحن میں عجیب و غریب اور بے ہنگم سی آوازوں کا شور بلند ہوا۔

"میا ۔۔۔ ؤ ۔۔۔۔ ں ۔۔۔۔ می ۔۔۔۔ آ ڈس ۔۔۔ ۔۔۔ ہو ہو ۔۔۔ بھوں ۔۔۔۔ بھو ۔۔۔۔ں ۔۔۔ آجا ۔۔۔ آجا ۔۔۔ ہاہا ۔۔۔ ہو ہو ہو ۔۔۔۔ ٹھر ۔۔ ررر ۔۔۔ ہر ۔۔۔ آ ۔۔۔ جھولا ۔۔ ۔کھا ۔۔۔ جھولا ۔۔۔ جھولا ۔۔۔۔"

یہ پلّو کی آواز تھی۔

پھر ایک دم زور سے آواز آئی۔

نصرت جبیں دوڑ کر باہر آئیں تو دیکھا۔ پانی کا گھڑا نل کے نیچے رکھا ہے اور پانی اس سے اُبل ابل کر گر رہا ہے اور پلّو بھورے سے بلونگڑے کو اٹھائے کھڑا ہے اور بالکل اپنے اسی انداز میں بلونگڑے کو اچھال اچھال کر ہنس رہا ہے۔ گدگدا رہا ہے اور جھلا رہا ہے اور وہ اس کی بانہوں میں لپٹا ہوا ہے۔

افکار ۱۹۶۷ء

مجھے دکھوں سے پیار ہے

بدنصیب شہزادی جب سفید براق، جگنو بھرے آنچل کو اڑاتی خدا کے حضور آئی اور اپنی بدنصیبیوں کا شکوہ کیا تو اس جگمگاتے آنچل کو روپہلی چمک والے فرشتوں نے منقش کٹوروں کو خوشیوں کے پھولوں سے بھر دیا ــــــ لیکن ساتھ یہ بتا دیا اے شہزادی بس تیری یہی بدنصیبی ہے کہ تو نے دکھ دے کے سکھ لے لئے۔ جب وہ خوشیوں بھرے آنچل کو لہراتی ہوئی واپس ہوئی تو کسی شہزادے نے اس کا استقبال نہ کیا۔ سب ہی اسے بے حد اداس نظر آئے۔ غم و اندوہ میں ڈوبے ہوئے لیکن ان کی آنکھوں میں متانت کی چمک تھی ــــــ پھر ــــــ پھر وہ بھری دنیا میں تنہا رہ گئی ــــــ اور اس نے گڑگڑا کر دعا مانگی۔ میرے اللہ میرے دکھ واپس دے دے۔ مجھے اپنے دکھوں سے پیار ہے۔ خوشیاں کم ہیں اور دکھ زیادہ خوشیاں ناپائیدار ہیں اور دکھ پائیدار۔ خوشیاں بے اثر ہیں اور دکھ پُراثر دکھوں میں وصال ہے اور اس کی لے خوشیوں کا امرت ہے۔ دکھوں کی تیرہ

شب میں دودھیا پرسکون چاندنی ہے۔ اس کی آہوں میں مترنم قہقہوں کی جھنکار ہے۔ چلو دکھ سہیں۔ یہی ہمارا مقدر ہے۔ یہی ہماری خوشیاں ہیں۔

درخشاں رحمان نے مٹھی بھر میٹھے چنے اور گڑ کی ریوڑیاں رومال میں باندھ کر باسکٹ میں رکھیں پھر دھاگے کاربن پیپر، میز پوش، ڈرائنگ کاپی جوں ہی باسکٹ میں ڈالی کہ آٹھ دس بچے "میٹھی آپا، میٹھی آپا" کہتے ہوئے اس کی ٹانگوں سے لپٹ گئے "ارے تو۔ اس وقت بھی یہ میرا پیچھا کرتے ہوئے یہاں تک چلے آئے ——" انجانا سا سرور اس کی نس نس میں اترتا چلا گیا۔ وہ ماں ہے۔ جگ ماتا۔ اور خدا نے اسے اتنے سارے بچے دیئے ہیں۔ اس نے رومال کھول کر سب کو میٹھے چنے بانٹے۔ باری باری ان کی پیشانی چومی اور پھر انہی کھیلتے کودتے کلکاریاں مارتے ہوئے بچوں کے ساتھ "بیت الرحمت" کے ہال کی جانب چل دی۔ مگر وہ تو یہیں محض صراحی تک آئی تھی۔ کیونکہ اسے پیاس لگی ہوئی تھی۔ —— ویسے بات تو ایک ہی ہے۔ بیت الرحمت میں بھی تو وہ پیاس بجھانے آئی تھی۔ دکھوں کی پیاس —— اس پیاس نے نہ جانے کہاں کہاں کس بھرے تھا کل کے سنائے ہوئے نغمے کے بول اب تک اس کے ہونٹوں پر مچل رہے تھے —— تیرے غم سے آشکارا میری زندگی —— تیرا غم —— ہے دراصل —— میری زندگی۔"

درخشاں رحمان نے جب پانی پی کر گلاس صراحی پر اوندھا دیا تو دھوپ شہتوت کے درخت اور عشق پیچاں کی بیلوں پر سے پھسلتی ہوئی کھسکتی چلی جارہی تھی جب وہ باورچی خانے سے پیاز اور آلو کے چھلکے باہر پھینکنے آئی تو بہت سا اندھیرا دبے پاؤں اندر سمٹ آیا تھا چپکے چپکے جیسے انجانے غم۔ مگر یہ اندھیرا کبھی اس کا کچھ نہ بگاڑ سکا۔ اور اس نے سارا اندھیرا نگل لیا تھا —— اس کے غم کوئی اتنے زیادہ نہ تھے یہی چھوٹی چھوٹی محرومیاں جو ایک متوسط طبقے کی عورت کی زندگی میں ہوتی ہیں یا اس سے

کچھ زیادہ۔ لیکن ہر قدم پر ہر دکھ نے اسے درد شناسائی کا حسن بخشا تھا۔ غموں کی یہی چھاپ کسی کو خوب صورت بنا جاتی ہے اور کسی کو بد صورت ــــــ دکھ کی یہ بات جتنی پرانی ہے اتنی ہی حقیقی۔ اپنی جگہ مسلم اور بے حد جدید۔ وہ یہ کہ زرینہ خانم نے آتے ہی لڑکوں پر لڑکیاں پیدا کرنی شروع کر دیں جس پر دادی جان اور سب گھر والوں کو سخت اعتراض تھا مگر زرینہ خانم تھیں کہ چکنا گھڑا۔ دادی بے چاری گڑگڑا کر دعائیں مانگتیں، کوستیں، چیختیں چلاتیں اللہ میاں کو پیاری ہوگئیں مگر زرینہ خانم ٹس سے مس نہ ہوئیں۔ بقول سکینہ پھوپھو بھابی کو تو لڑکیاں جننے کا شوق ہے اور ساری گڑبڑ تھی ہی زرینہ خانم کی ورنہ تو وہ خود بھی اماں کی ساتویں صاحبزادی کیوں ہوتیں رزاق میاں کا بھی اب تو گھر بس دل کم ہی لگتا تھا۔ ہر جگہ گڑیاں ہی گڑیاں بکھری تھیں۔ بھلا کوئی گڈا بھی تو ہوتا ان میں۔ اب یہ تو کوئی زرینہ خانم کے دل سے پوچھتا جو باپ دادا کا نام لیوا ایک عدد کماؤ پوت کو جنم دینے کے لئے کس قدر دلجمعی سے لگی ہوئی تھی۔ ورنہ انہیں کیا ضرورت تھی کہ ہر سال نیا روگ لگائیں ــــــ پر خدا کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔ ساون بھادوں کی جھڑی میں جب ساری گڑیاں گیلری میں ٹھساٹھس بارش کی بوندیں ہتھیلی میں جمع کر رہی تھیں رزاق میاں بے چینی سے برآمدے میں چہل قدمی کر رہے تھے۔ پھوپھو جان دوڑی دوڑی پھر رہی تھیں اور زرینہ خانم کی جان لبوں پر تھی کہ شاہد میاں تشریف لے ہی آئے اور چند ہی ساعتوں بعد تیلی سی آدھ موئی ایک اور گڑیا آن ٹپکی۔ ''اے لے ماں موئی ــــــ یہ بھی رہ گئی تھی کسی کونے کھدرے میں۔'' پھوپھو اماں کو آج اتنی مدت بعد زرینہ خانم پر پیار آ رہا تھا۔ سب ہی اس کے دھیمے دھیمے سانسوں کے رکنے کا انتظار کرتے رہے۔ وہ بھی آخر کو زرینہ خانم کی اولاد تھیں۔ اسی لمحے ڈوبتے ڈوبتے سانس تیز ہوگئے اور اس نے چیں چیں آواز میں رونا شروع کر دیا۔

دوسرے ہی دن زردسی جھکی جھکی زرینہ خانم تن کر بیٹے کو گود میں لئے بیٹھی تھیں۔ گویا بیٹے کی ماں ہوں۔ اب کوئی کچھ کہہ کر تو دیکھے۔ گھر کے سارے افراد گھیرا ڈالے بیٹھے تھے۔ مسئلہ دونوں کی بیک وقت پرورش کا تھا جو اسی وقت سب کے متفقہ فیصلے سے طے پا گیا تھا کہ چھوٹی کو سارو لے جائے۔ اسی وقت چھوٹی کی دودھ کی بوتل، فراکیں اور پوتڑے الگ کر کے سارو کو تھما دیئے گئے۔ وہ خوشی خوشی گھر لے آئی۔ کھجور کی چٹائی کے سائے تلے بانس کی کھاٹ میں جھولا باندھ کر اس میں ڈال دیا۔ سارو کا خاوند یار خان دن بھر گدھا گاڑی چلاتا تھا۔ گھر پر کم ہی رہتا تھا اس کا ننھا بیٹا جانو ہر وقت اسے اٹھانے کے لئے مچلا کرتا۔ سارو ابتداء میں تو ہفتے میں ایک بار چھوٹی کو بی بی جی کے پاس لے جاتی تھی۔ پھر کبھی دو ہفتوں بعد اور کبھی کبھی مہینہ بھی ہو جاتا۔ سارو کے محبت بھرے دل اور سیاہ مضبوط ہاتھوں نے بالشت بھر کی نیلی گڑیا کو جلد ہی خون بھرا غبارہ بنا دیا۔ گول مٹول گھاس پھوس کی سڑی لپاند والی جھونپڑی میں جانو کے ساتھ کھیلتی ہوئی کیچڑ میں گلاب کا پھول لگا کرتی اور زرینہ خانم کے دل میں کمزور سے ننھے کو دیکھ کر پھولی پھولی چھوٹی کے لئے نفرت کی آگ بھر جاتی۔ مامتا کا یہ روپ کتنا بھیانک تھا ـــــ اور ناقابلِ یقین۔ رزاق میاں ہر ماہ چھوٹی کی ضرورت کی چیزیں بھجوا دیا کرتے تھے اور ساتھ ہی اچھی تنخواہ بھی۔ سارو کے دن پھر گئے تھے اس نے اپنی جھونپڑی کی چھت پر مزید کھجی کی چٹائیاں ڈلوا کر پکی کرالی تھی۔ دلواروں اور زمین پر بھی مٹی کا لیپ دلوا دیا۔ چھوٹی کی کھٹولی کے ساتھ ایک جھولتی ہوئی میز رکھ لی تھی جس پہ دودھ کی بوتل، سفید پلاسٹک کا گلاس۔ لکڑی کا ایک گھوڑا۔ ربڑ کی بلی۔ ٹوٹا ہوا جھنجھنا اور ساتھ ہی چند فراکیں روزانہ بڑی ترتیب سے رکھا کرتی۔ جانو کے بھی ایک دن چھوڑ کپڑے بدلتی۔ اور اب وہ خود بھی ہفتے میں دو بار سر دھوتی اور رنگا چنی سے اپنے سر کنڈے کے سے بالوں کو سمیٹتی۔ لالی۔ فنو اور زلیخا

رشک وحسرت سے اسے دیکھا کرتیں۔ یار خان بھی اس تبدیلی سے خوش تھا۔ خوشی کے چند ہی دن تو گزرے تھے کہ سارو نے دیکھا کہ چھوٹی بڑی تیزی سے بڑھ رہی ہے اور عنقریب ہی بی بی جی اسے واپس لے لیں گی۔ یہ سوچ کر اس کا دل ڈوبنے لگا۔ جانو کو دیکھ کر وہ بھی سارو کو اماں کہنے لگی تھی تو وہ اپنی موٹی موٹی سیاہ انگلیاں بڑے پیار سے اس کے دہکتے رخساروں پر پھیر کر کہتی۔

"ہم تمہارا اماں نہیں ہے۔"

"تو پھر ہمارا اماں تو نسا ہے بتاؤ نی۔" وہ اس کے گلے میں جھول جاتی۔

"تمہارا اماں ادھر پیلا مکان والا ہے جدھر ہم تم کو کبھی کبھی لے کے جاتا ہے۔"

"وہ ہمارا اماں نہیں ہے۔ ہم اس کے پاس نہیں جائے گا۔" اور وہ وہیں چت ہو جاتی۔

سارو کا بے حد جی چاہتا کہ وہ اپنے دل کی بات کہہ دے۔ ضرور کہہ کر تو دیکھے اور ایک دن ہمت کر کے ڈرتے ڈرتے اس نے کہہ ڈالا۔

"بی بی جی چھوٹی کو ہم لیں گا — ہاں — تمہارا پاس تو بہت لڑکی ہے وافر۔"

"یہ لو — یہ بھی کوئی پرانی پیڑھی یا کھاٹ ہے کہ ہم لیں گا۔ لڑکی کی ذات۔ رشتہ دار سنیں گے تو میری پوتیاں بھی نوچ لے جائیں اے جانو کی ماں بہت ہیں تو کیا ہوا — سب اپنے پیٹ کی جنی ہیں۔ بس اب تم اگلی ہی اتوار کو لے آؤ انہیں ایک دم چھوٹی نہ جانے کیسے اہم معلوم ہوئی۔ اور سارو نے بڑی بے دلی سے اگلے اتوار تک رونما ہونے والے حادثے کے لئے خود کو تیار کرنا شروع کر دیا۔ اور چھوٹی کو بھی کہ بڑا سا گھر ہو گا۔ بہت سی بہنیں اچھی اچھی چیزیں۔ اور پلک جھپکتے ہفتہ گزر گیا۔ سارو اسے چھوڑ کر جانے لگی تو وہ ایک بار پھر اس سے چمٹ گئی۔ رخو نے الگ کرنا چاہا تو اس کا ہاتھ کاٹ کھایا۔ اس نے اسے وہیں پٹخ دیا۔ وہ اٹھ کر دوبارہ سارو

کی جانب پیچی تو پنو نے جالیا۔ وہ تڑپ کر ہاتھوں سے نکل گئی اور چپت سارا گھر سر پر اٹھا لیا۔ شاہد میاں کو چھوٹی کا مچلنا نہ بھایا۔ انہوں نے آکر ایک لات جمائی تو سب اس ادا پر کھلکھلا کر ہنسے۔ اس پر چھوٹی نے دونوں لاتیں جما کر گرا دیا۔ بیک وقت سب کی آنکھوں سے آگ برسی اور زرینہ خانم کے ہاتھوں سے بھی۔ انہوں نے پاس ہی رکھا ہوا جوتا دے مارا۔ پھر دوسرا اور سارو اب تک بت بنی سیڑھیوں پر کھڑی تھی ——— "تم کیوں کھڑی ہو اب تک۔ ہمارے دبن کر۔ ہم بہلا لیں گے۔ لڑکی پالی ہے یا بلیا۔ سانڈ کی طرح ہاتھ ہی نہیں لگنے دیتی کسی کے۔" زرینہ خانم دروازہ بند کرتے ہوئے دھاڑیں۔

رات بھی وہ الگ پڑی نیند میں اٹھ اٹھ کر روتی رہی ''سارو اماں، سارو اماں'' پکارتی رہی۔ کہاں تو وہ اس کے ساتھ لپٹ لپٹ کر سوتی اور کہاں وہ اسے اکیلے چھوڑ چھاڑ کر نہ جانے کہاں چل دی۔ رزاق میاں نے تنگ کر صبح سویرے ہی سارو کے پاس بھیجدیا اور کہلوا دیا کہ روزانہ شام کو تھوڑی دیر کے لئے لے آیا کرے تاکہ آہستہ آہستہ مانوس ہو جائے۔ اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ جانو نے تالی بجا کر چھوٹی کا استقبال کیا۔ "ہمارا میم آگیا۔ ہمارا میم آگیا۔" سارو نے پھر سے جھولتی ہوئی میز اس کے کپڑوں اور ٹوٹے پھوٹے کھلونوں سے سجا دی۔ یار خان قریب ہی سے گرم گرم جلیبیاں لے آیا۔ سب نے مل کر کھائیں۔ ایک دن اور رات کے ڈراؤنے خوابوں کے بعد چھوٹی کے وہی سے دن لوٹ آئے۔ کچے فرش پر پھسکڑا مار کر بیٹھنا جانو کے ساتھ کنچے کھیلنا چلتے پھرتے روٹی دانتوں میں دبائے پھرنا۔ ہوٹل کے قریب ریت پر لوٹیں لگانا۔ پلو اور پھدو کے ساتھ پتنگ اڑانا۔ پیچ لڑانا۔ یہ سب کچھ اتنا مزیدار تھا اور پھر اماں کے گھر نہیں ہو سکتا تھا۔ وہاں تو جگہ جگہ پہرہ تھا۔ ہر ایک سنگین لئے نظر آتا تھا۔ اب وہ موٹی موٹی گالیاں دینا بھی سیکھ گئی تھی

ادھر کسی نے چھیڑا یا ستایا اور اس نے تگڑی سی گالی اگل دی۔ سارہ شام کو روزانہ اسے ملانے لے جایا کرتی تھی لیکن وہاں وہ اجنبیوں کی طرح چپ چاپ ہر چیز کو تکا کرتی۔ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی۔ ڈرتے ڈرتے کسی چیز کو چھوتی تو سب کو دیکھ لیتی سال بھر ہو گیا اور وہ ایک دن بھی رہنے کے لئے آمادہ نہ ہوئی۔ شاہد اب اس کے قریب کم ہی آتا تھا۔ ایک آدھ بار ہلکی سی چپت کی کوشش کی اور زور دار مکا کھایا۔ جس پر فرحت اور پنو نے مل کر چھوٹی کے خوب کلے نوچے۔ کم بخت ڈائن ہے کھا جائے گی بھائی کو۔" زرینہ خانم کو واقعی خدشہ تھا۔ اسے جانو یاد آجاتا جس نے خواہ مخواہ کبھی اسے پیٹنے کی کوشش نہیں کی۔ چاہے کیسا بھی رال ٹپکاتا۔ ناک سڑ سڑاتا۔ آنکھوں میں چیپڑ بھرے، ننگے پیر لمبے لمبے ناخنوں میں سیروں کیچڑ بھرا ہوئے ہوتا تھا۔ اسے اچھا ہی لگتا تھا جو اکثر اپنے ادھنّے سے گوندیاں اور میٹھے چنے شیدی کے ہوٹل سے خرید کر دیتا تھا اور خریدتے وقت بڑے فخر سے کہتا تھا۔ "شیدی ہمارا میم کو بھی دو۔" اس پر شیدی ایسی دل دہلا دینے والی ہنسی ہنستا تھا کہ وہ سہم جاتی ——— چلو جاؤ ——— تم کالا ہے گندہ ہے۔ ہم تمہارا میم نہیں ہے۔" اسے ایک دن سخت غصّہ آگیا تھا۔ جانو نے بھی دن بھر بات نہیں کی۔ اسے کنچے کھیلنے، پتنگ اڑانے اور ریت پر لوٹیں لگانے میں ذرا بھی مزہ نہ آیا ——— "اچھا بابا ——— تمہارا بھی میم۔" اسے اپنے سفید ہاتھ پسینہ میں ڈوبی ہوئی سیاہ گردن میں ڈال کر منانا ہی پڑا ——— ایک یہ شاہد ہے اماں کا لڑکا! تمام دھو تھوتھنی بنائے ہر وقت پٹائی کے لئے دوڑا کرتا ہے۔

" سارہ بس ہم کہتا ہے، کان کھول کر سن لو۔ ہم اماں کے گھر کبھی نہیں جائے گا۔" ایک شام اماں کے گھر سے واپسی پر اس نے اپنا قطعی فیصلہ سنا دیا ——— چھوٹی بدستور سارہ کے ساتھ ہوتی تھی۔ کبھی کبھی یار خان کے ساتھ گدھا گاڑی میں بھی جاتی تھی۔ وہ اکثر سیر کرانے کے لئے دونوں کو بٹھا لیتا۔ دونوں گدھے کی لگامیں تھام کر

ٹخ ٹخ اور ہیا ہیا کرتے دوڑایا کرتے اور یار خاں ہنستا ہوا دیکھا کرتا۔ ایک دن وہی ہوا جو کبھی نہ کبھی ہونا ہی تھا کہ گدھا گاڑی عین رزاق میاں کی دوکان کے سامنے سے نکل گئی جس میں ان کی صاحبزادی گدھے کی لگامیں تھامے ٹخ ٹخ گاڑی بھگائے لئے جا رہی تھی۔ اسی شام چھوٹی کو بلوا بھیجا ''آہا چھوٹی اب یہیں رہے گی۔ چاہے مرے چاہے جئے،'' رفو نے دیکھتے ہی کہا۔ اس پر چھوٹی نے ایسی زبردست گالی بکی کہ سب دہل گئے اور رزاق میاں کے تو چھکے چھوٹ گئے۔ اسی شام اسے اٹھا کر ایک کمرے میں ڈالا اور سارو کو آنے سے بالکل منع کر دیا۔ اس دن سارو چپ چاپ مٹی کے کچے فرش پر لیٹی رہی۔ اس کے گھنگھریالے بال سرکنڈے کی جھاڑیوں کی طرح کھلے رہے اور میٹ (کاجل) بھیگا رہ گیا۔ جانو بھی خاموش ماں کے سرہانے کھجور کے خشک پتوں سے کھیلتا کھیلتا سو گیا۔

سارو سے جدائی چھوٹی کی زندگی کا سب سے پہلا بڑا غم تھا۔ وہ بند کمرے میں پاگلوں کی طرح روتی چیختی اور سر پٹختی رہی۔ جب تھک کر نڈھال ہو گئی تو نہ جانے کب سو گئی۔ جب اٹھی تو خود کو برآمدے میں پایا جہاں اس کی ساری بہنوں کے بستر لگے تھے اور وہ اسے دیکھ کر سرگوشیاں کر رہی تھیں اور ہنس رہی تھیں۔ دن بھر سب نے باری باری خیال رکھا اور اسے بالکل نیچے نہ اترنے دیا وہ دن بھر ہی جنونی حرکتیں کرتی رہی۔ مار پیٹ لوٹ کھسوٹ، توڑ پھوڑ اور زرینہ خانم واقعی اپنی قسمت پر پھوٹ پھوٹ کر رو دیں ___ اور پھر چھوٹی نے ایک اور ترکیب نکالی اور رات باقاعدگی سے بستر پہ پیشاب کرنا شروع کر دیا۔ لیکن وہ بھلا کب تک اس کے رعب میں آتیں۔ ایک دن ایسی خبر لے ڈالی کہ وہ سب کچھ بھول گئی اور سارو تو کیا اس کے فرشتے تک اب اسے یاد نہ آ سکتے تھے۔ وہ اب بالکل الگ الگ اجنبیوں کی طرح رہتی۔ کوئی پہل کرتا تو کاٹ کھانے کو دوڑتی۔ زبان الگ چوپٹ تھی۔ جب شاہد سے بدلہ لینے پہ اتر آتی تو زرینہ خانم بمع بہنوں

کے پننگے لگ جاتے اور وہ اسے دھن کر رکھ دیتیں ـــــ ڈانٹ! یہ تو سب کو کھا جائے گی۔'' سب ہی کو خدشہ تھا ـــــ ایسے ہی میں ایک دفعہ جب وہ منہ لبسورتی نیچے اتر گئی اور دیر تک وزیر ہیر کٹنگ سیلون'' کے سامنے منہ پھلائے کھڑی رہی تو ایک حجام نے عجیب شکلیں بنا کر اسے ہنسا ڈالا تو وہ اسے بے حد اچھا لگا اور پھر وہ دوسری کرسی پر بیٹھی آئینہ میں سے اس کی شکل دیکھ کر ہنسا کرتی۔ اس کے علاوہ موچی زلاب گل جوتے گانٹھتے ہیں جو تیز تیز ہاتھ چلاتا تو اسے دیکھنے میں بڑا مزہ آتا۔ وہ بڑی پھرتی سے آری سے موم لگا ہوا دھاگہ نکالتا اور پھر آری سے چمڑے میں گھونپ دیتا پھر لوہے کے اوزار پر جس کا اگلا حصّہ پھیلا ہوا ہوتا ہے تیزی سے چند بار پتھر پر رگڑتا۔ چمڑے کے ٹکڑے پر رکھ کر جونہی دباتا بڑی صفائی سے چمڑا کٹ کر علیحدہ ہو جاتا۔ اس کا دل چاہتا کہ وہ یہ اوزار لے کر کاٹ کاٹ سارے چمڑوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے۔ موچی کے دوسرے جانب مائی جام والی کچے امرود لئے بیٹھی رہتی تھی۔ چھوٹی اکثر اسے سڑک پر سے کاغذ جمع کر کے دیتی اور وہ اسے کچے امرود کے دو چار قتلوں پر مٹی سا مصالحہ ڈال کر دیتی اور وہ آڑ لے کر چٹ کر جاتی۔ کسی حد تک اس نے اپنے لئے پہلے سا ماحول پیدا کر لیا تھا۔ اب اس کے بہت سارے دوست تھے۔

شاہد ایک عرصے سے اسکول جانے لگا تھا۔ ایک آدھ بار اس نے کھٹ مٹھی گولی دے کر دوستی کا ہاتھ بھی بڑھایا۔ لیکن اس نے اس زور کی چٹکی لی کہ اس کی پھر کبھی ہمت نہ پڑی ـــــ بہت دنوں کے بعد ایک دن جب رزاق میاں نے چھوٹی کو شاہد میاں کی کاپی پہ آڑی ترچھی لکیریں لگاتے دیکھا تو انہیں ایک دم خیال آیا کہ اسے بھی کسی قریبی اسکول میں داخل کرا دیا جائے۔ تو وہ اسی وقت اس کا ہاتھ پکڑے اسکول لیتے گئے۔ فارم بھرنے لگے تو چھوٹی کا نام ہی ذہن میں نہ آئے۔'' نہ جانے کیا نام رکھا تھا۔ نامعقول سا۔''

"آں ہاں ــــــ چھوٹی کیا نام ہے تمہارا؟"، انہوں نے سوچا شاید چھوٹی کو ہی معلوم ہو۔

"چھوٹی ـــــــ" اور جیسے اپنے ہی الفاظ سننا کمران کے ذہن میں پیوست ہو گئے۔

"اوں۔ ہونہہ ـــــ نام بھی تو ہوتا ہے۔ جیسے بے بی کا نام روبینہ ہے"۔

"ہمارا نام تو چھوٹی ہی ہے ـــــ بے بی کا نام ہوگا روبینہ!"

رزاق میاں گھر آئے بیگم سے پوچھا۔

"ایں! ــــ نام ــــ اے لو نام میں کیا رکھا ہے۔ کوئی سا لکھ لیں"۔

"ہاں تو چھوٹی بھئی تم ہی بتاؤ کیا نام رکھیں تمہارا"۔

"درخشاں "

"آں ہاں ــــ درخشاں عمر سات سال ــــ وہ جلدی جلدی لکھنے لگے۔ اور نذیرہ خانم۔ اس کی وحشی بلی کی سی آنکھیں اور ناریل کے سے الجھے بالوں کو دیکھ کر کہتی رہیں"۔ سات سال کی لٹھ مڑکیں ناپتی پھرتی ہے۔ اس کی عمر کا شاہد تیسری جماعت میں آ گیا ہے۔ ہم ــــ ہم تو اس عمر میں گھر کا سارا بوجھ اٹھائے ہوئے تھے۔ اماں کو خبر ہی نہ ہوتی تھی گھر میں کیا ہو رہا ہے ـــــ" اور کچھ ایسی ہی زہر خند نظروں سے دیکھتی رہی کہ پھر کبھی بھی اس کا دل نظریں ملانے کو نہ چاہا اور وہ بڑی معصومیت سے اب تک سوچا کرتی۔ توبہ اللہ ایک جانو کی اماں تھی اور ایک یہ میری اماں ـــــ کیا اماں ایک سی نہیں ہوتیں۔ کیا اپنی ہی اماں کے پاس رہنا ضروری ہوتا ہے۔ کتنا ہی اچھا ہوتا اگر سارہ ہی اماں ہوتی اور جا تو میرا بھائی۔ ہم مل کر اسکول جایا کرتے۔ اسے پھر بہت سی باتیں یاد آنے لگیں۔

اسکول میں پہلے دن تو آپا جان جو اس سے کچھ ہی بڑی لگتی تھیں بڑی عجیب سی

نظروں سے دیکھتی رہیں اور لڑکیاں بھی۔ اس کے گوٹے لگے کپڑوں کو جو اس نے پچھلی
عید پہ پہنے تھے پھر جب چھینٹ کے تھیلے سے سلائی کی مشین سے سِلی ہوئی بھورے
کاغذ کی ٹیڑھی میڑھی کاپیاں اس نے نکالیں تو وہ چلائیں اور درخشاں نے سامنے
ہی کھلکھلاتی ہوئی لڑکی کے منہ پہ کاپی دے ماری۔ آپا جان نے دونوں کو ڈانٹا پھر
سمجھایا۔ اس کے بعد اور کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہ آیا بس یہ ہوا کہ درخشاں خوب
دل لگا کر پڑھتی اور زرینہ خانم بھی اگر سارو کی طرح پیار نہ کرتی تھی تو پھر پہلے کی سی
اماں کی طرح شاہد سے چڑ کر ٹپائی بھی نہ کرتی تھیں۔ اسے اب صرف اپنے کام سے کام
تھا۔ پڑھائی میں اور بیکار مشغلوں میں وہ اس قدر غرق رہنے لگی تھی کہ گھر میں نت
نئی تبدیلیوں پر بھی اس نے توجہ دینا چھوڑ دی۔ اس دوران جب کہ اماں لڑکیوں کے
فکرات میں گھری تھیں اور اپنی قوت تدبیر سے غم کی بدلیاں چھٹانے بھی لگی تھیں۔
وہ دھڑا دھڑ گڑیاں بیاہنے لگیں۔ بڑی سوجھ بوجھ سے اچھے اچھے لڑکوں کے ہاتھ تھماتی
گئیں۔ نہ جانے کس ترکیب سے سب بھونچکا رہ گئے۔ لیکن جب رضیہ اور فوزیہ کی باری
آئی تو گڈے غائب! ہاتھ ہی نہ لگے۔ زرینہ خانم کی چاروں لڑکیوں کے بیاہے جانے پر
نظر لگ گئی۔ جس پہ چند ایک تو باقاعدہ نسخے کے طور پہ بھی پوچھ بیٹھی تھیں مگر وہ
تمام رضیہ اور فوزیہ پہ آکر ٹوٹ گئی اور زرینہ خانم کا انجانا نسخہ دھرا رہ گیا۔ وہ
دونوں نہ جانے کب سے تڈل کئے بیٹھی تھیں اور گڈے بھی کچھ زیادہ ہی چالاک ہو گئے
تھے۔ چوہے دان میں شروع شروع تو روٹی کے ٹکڑے کے لالچ میں خوب چوہے پھنستے
ہیں لیکن بعد میں وہ بھی ہوشیار ہو جاتے ہیں۔ یہ دونوں بوٹے سے قد کی سانولی گڑیاں
زرینہ خانم کی غیر موجودگی میں لہک لہک کر فلمی گیت گاتی تھیں اور ابا میاں کی پرانی
ڈائریاں پڑھتی تھیں۔ رزاق میاں بیمار رہنے لگے تھے اور آمدنی کے ذرائع محدود ہو
گئے تھے۔ ان تمام جھگڑوں نے زرینہ خانم کو اس قدر مصروف رکھا کہ درخشاں کی طرف

توجہ ہی نہ دی اور درخشاں کے میٹرک کے نتیجے نے سب کے چھکے چھڑا دیئے اور زرینہ خانم کے دانتوں تلے پسینہ آ گیا۔ اس خاندان میں آج تک کسی لڑکی کو میٹرک نہیں کرنے دیا گیا تھا۔ اس پر طرہ یہ کہ وہ جب دیوانوں کی طرح اخبار لئے دوڑی چلی آئی تو زرینہ خانم کے حواس جاتے رہے۔ فوزیہ اور رضیہ دونوں سے نکلتا ہوا قد بھرا بھرا جسم، خوشی سے دمکتے ہوئے چہرے پر کنول سی کٹورہ آنکھیں۔ مچلتی لہراتی دوڑتی ہوئی وہ بے چین دوڑتی تیرتی ہوئی مچھلی کی طرح لگ رہی تھی۔ چھوٹی اتنی خوب صورت بھی ہو سکتی ہے۔ زرینہ خانم سوچوں میں غرق تھیں۔ رضیہ اور فوزیہ کے غم نے انہیں بوڑھا کر دیا۔

لیکن ایک دن کیا ہوا۔ ایک شہزادہ بڑی آن بان سے وہاں اتر آیا۔ گلاب شہزادی کو کالے دیو نے نظر بند کر دیا تا کہ شہزادے کی نظر دو گڑیوں کے سوا کسی پر نہ پڑے۔ لیکن وہ بڑا چالاک نکلا اور ـــــ درخشاں کو لے اڑا۔ سب منہ تکتے رہ گئے۔ پر یہ شہزادہ (رحمان) تھا۔ بڑا شوخ و چنچل اور بے حد سوشل۔ جو اس کی کٹورہ سی تیزی سے ناچتی ہوئی سیاہ آنکھیں اور لال گلال دہکتے رخساروں پر مرمٹا تھا ـــــ مگر وہ تو محض ابال تھا۔ وقتی طور پہ جذبات کا بہاؤ ـــــ اور وہ ـــــ وہ تو سمٹی چلی گئی تھی ـــــ اس کے منتشر وجود کو بہت سے تجربات نے ٹھوس بنا دیا تھا جن میں تفکرات کی لہریں جذب ہوتی چلی گئی تھیں اور خوشی کی رو منعکس ہوتی رہی۔ اب وہ اتنی سنجیدہ مغرور، کم گو اور کم آمیز تھی کہ شہزادہ واقعی پریشان ہو گیا۔ شادی کے دوسرے ہی دن جب اس نے بڑے فخریہ انداز میں اعلان کیا کہ آج رات وہ ہوٹل فردوس میں گزاریں گے تو اس نے فرمانروا بیوی کی طرح بلا چوں چرا کئے اس کا پسندیدہ لباس زیب تن تھا جو لباس ہی نہ تھا محض حسن کی نمائش اور وہ اتنی خوب صورت اور اس قدر نازک لگ رہی تھی۔ "تم کسی سنگ تراش کا جیتا جاگتا مجسمہ ہو ـــــ دنیا کا سارا حسن تمہارے سامنے ہیچ ہے۔ مونا لیزا کی مسکراہٹ تمہاری معصومیت کے آگے ماند ہے۔ ازل سے لے کر

اب تک تمام مصور شاید اسی حسن کے متلاشی ہیں،" رحمان انتہائی مغربی انداز میں اظہار محبت کرتا رہا۔ اس کے دوست بھی اسے دیکھ کر دنگ رہ گئے اور درخشاں نے زندگی میں پہلی بار نیم عریاں تھرکتے ہوئے جسم دیکھے۔ موسیقی کی شوخ و تُنگ دھنوں میں سڈول و سپید مرمریں تڑپتی مچلتی پنڈلیاں لہراتے جھومتے جسم وہسکی اور شمپین کی لہریں جھومتے بہکتے انسان دیکھے۔ یہ سب کچھ کتنا عجیب تھا۔ سب بے حد مسرور نظر آتے تھے لیکن یہ کیسا سرور تھا۔ دل میں بسا ہوا ایک انجانا سا درد اس کے سارے جسم میں کہیں اندر رگ رگ میں دوڑتا پھرتا رہا۔ رحمان اس کا اپنا رحمان! بہکتا جھومتا کتنا خوفناک! کیسا بھیانک نظر آ رہا تھا جیسے اژدھا یہ جسم کا بوڑھا شکاری کتا۔

یہ رات بڑی کربناک تھی کچھ ایسی ہی جب وہ سارو سے جدا ہو کر سوئی تھی۔ وہ ایک بار پھر تنہا تھی۔ یہ سب باتیں اس کے لئے نئی تھیں۔ بالکل نئی۔ پی لو رحمان کا مرید! ـــــ اس سے رفاقت کا احساس بڑھ جاتا ہے۔ سب۔ سب بہت پیارے لگتے ہیں ـــــ بے حد حسین۔ ہم بے حد تنہا ہیں۔ ہمیں رفاقت کی ضرورت ہے۔ ادھیڑ عمر مسٹر بدر بلوریں نقشی پیالیاں آگے بڑھا رہے تھے اور ان کی آنکھوں میں درخشاں ہی درخشاں تھی۔ ـــــ وہ چپ چاپ اسٹیج پر نظریں جمائے بیٹھی رہی۔ سارو، جانو اور یار خاں اسے بے حد یاد آتے رہے۔ سارو! اس کی اپنی اچھی سی سارو جو اب تک برتن مانجھتی تھی اور یار خان جسے دن دہاڑے کسی نے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا اور اس سے فقط سارو کے غموں میں اضافہ ہوا تھا اور تو دنیا کے نظام میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ جانو کو اس نے ایک عرصہ کے بعد دیکھا تھا۔ جب وہ سر جھکائے رزاق میاں سے باتیں کر رہا تھا۔ وہ کتنا نکھرا جوان ہو گیا تھا۔ مگر اس کی بیوی ایک عرصہ سے ٹی بی کا شکار تھی۔

رحمان سامنے بیٹھا مسکرائے جا رہا تھا اور نہ جانے کیا کہہ رہا تھا۔ مسٹر بدر قہقہے پر قہقہہ لگا رہے تھے۔ رحمان! تم ___ تم ___ بے حد خوش نصیب ___ ہو ___ ہاں۔"
وہ نہ جانے کیا کچھ کہہ رہے تھے۔

"کیا اسے رفاقت کی ضرورت نہیں ___ کاش ___ وہ بھی زندگی کو یہی جام سمجھ کر پی سکتی۔"

رحمان ہر وقت رقص سیکھنے کے لئے اصرار کرتا رہتا۔ اس کے لئے اپنے دوستوں کی مدد بھی چاہی۔ اندھے کو کیا چاہیئے دو آنکھیں۔ وہ بڑے خلوص سے ڈانس کی انسٹرکشن دینے کے لئے آنے لگے۔ آہستہ آہستہ عجب بہکی بہکی حرکتیں بھی کرنے لگے۔ تو میری حیثیت محض کیرم کی اس گوٹ کی سی ہے جو اسٹرائیکر کی زد سے یہاں سے وہاں لڑھکا کرتی ہے۔ میری کوئی انفرادیت نہیں۔ کوئی مقام نہیں۔ بس وہ شہزادے کی لاٹھی سے ہنکتی رہتی ہے۔ اماں کی رسی سے گلہ چھڑا کر شہزادے کے کھونٹے میں بندھ گئی ہے۔

رحمان کے دوستوں کے التفات حد سے زیادہ بڑھنے لگے تو درخشاں کی فرمانبرداری میں کمی ہونے لگی اور شہزادہ جلد ہی درخشاں سے تنگ آ گیا۔ اتنی قدامت پسند اسی قدر گھسے پٹے خیالات کی لڑکی! اسے اپنے انتخاب پر غصہ آنے لگا۔ کبھی جب وہ کانپتے لڑکھڑاتے قدموں گئی رات واپس ہوتا تو اسے پیٹ بھی ڈالتا۔ یہ بات بے حد تلخ اور ذلت آمیز تھی جو اللہ رکھی کے شوہر تک ہی محدود ہو سکتی تھی۔ جو اپنے سوکھے کالے بھجنگ جسم کو کھول کر بیٹھ جاتی تھی اور شوہر کی مار کے نشان دکھایا کرتی تھی جو سیاہ رنگت کے باعث نظر ہی نہ آتی تھی۔ اور وہ اسے چھیڑا کرتی۔ بھگتو اب اپنے میاں کو ___ بیاہنے کا کیا اتنا شوق تھا جو۔"

"ہاں بی بی وقت آنے دو، میں بھی دیکھوں کیسے ارمان نہیں ہوتا بیاہنے کا۔"

اور واقعی یہ تو اسے اس وقت معلوم ہوا جب رحمان اس پر مر مٹا تھا تو محبت کا در

کتنا شیریں اور کس قدر سحر انگیز تھا۔ اس نے رکھو کے شوہر کو جلدی پنچلے چلنے کے بڑے انسانوں میں شامل کر لیا تھا۔

تو اب رکھو اور میری زندگی میں کوئی فرق نہیں سوائے سکوں کی چمکتی چادر کے جس نے ان کو ڈھانپ رکھا تھا۔ اس چمکتی چادر کی چکا چوند سے ہم کب تک آنکھیں میچے رہیں گے۔ کیا ہم موجودہ چکا چوند کے سمندر کو پاٹ نہیں کر سکتے۔ اس کی زندگی پھر آن کر ایک نقطے پر رک گئی جہاں اداسی ہی اداسی اور تنہائی ہی تنہائی تھی۔ اسے یوں لگتا تھا جیسے وہ صدیوں سے اس گھور اندھیرے میں پڑی سسک رہی ہو جہاں اس کی بوڑھی ساس کڑھا کرتی ہے۔ بہو جس نے اس کے بیٹے کو دو کوڑی کا بھی نہ رکھا تھا۔ شوہر کو محبت تو کیا دیتی اس کے لئے ایک بچہ تک نہ جن سکی ــــ یہ سوچ کر اس کے حلق سے کوئی کڑوی کسیلی چیز اترنے کا نام ہی نہ لیتی۔ تو کیا یہ دکھ اس کا اپنا نہیں ہے۔ عورت ہو کر عورت کا غم نہیں جانتی۔ حسد رقابت کا یہ پردہ کب تک اسے کب تک اندھا کئے رکھے گا۔ ــــ اس بے کراں تنہائی میں کئی بار اس کا جی چاہا کہ ننھا سا گول مٹول۔ نرم و نازک سا بچہ۔ اس کی گود میں ہمک رہا ہو۔ لیکن محض چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔ عمر کے اس حصے میں اس نے بے حد چاہا کہ اسے ننھا سا ساتھی مل جائے تاکہ اس کے غم آدھے ہو جائیں۔ لیکن رحمان بہت ہی کم گھر آتا اور پھر ــــ وہ کچھ بھی نہ کر سکی۔ بس اندھیرے سمندر سے باہر نکلنے کے لئے ہاتھ پیر مارتی رہی۔ جانو۔ جانو پھر اس کے سامنے سر جھکائے کھڑا تھا۔ صحت مند، توانا، مضبوط۔ اس کا دل چاہا۔ اف وہ اس خواہش میں اندھی ہوتی جا رہی تھی۔ وہ جس کے مضبوط بازو سکھی کی کشتی کے پتوار تھے اور رحمان جس کے سرخ و سفید توانا ہاتھ سیمیں بدن تڑپتی حسیناؤں کی کمر کا حلقہ۔

ایک دن گرمی کی چلچلاتی دھوپ میں گرم ہواؤں کے تھپیڑوں میں جب بیلا

چنبیلی کی ڈالیاں نیم مردہ سی جھول رہی تھیں۔ سدا بہار کے سفید اور گلابی پھول جھلس رہے تھے۔ سورج کی تیز کرنیں سنسناتی ہوئی جسم میں چبھ رہی تھیں۔ شہزادہ (درخشاں) چلا گیا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں کوئی آنسو نہ تھا ـــــــ ہر ہر لمحہ بے حد طویل ہو گیا۔ رات بھر کہیں بچہ روتا رہتا اور اس کی آواز جلترنگ بن کر میٹھا میٹھا سا درد پیدا کرتی رہی۔ نہ جانے وہ کب تک گول مٹول بچے کو اٹھائے پھرتی رہی۔ بھینچ بھینچ کر پیار کرتی رہی۔

خوابوں کی حسرت آگیں دنیا میں رہتے ہوئے ایک عرصہ گزر گیا۔ ایک صبح جب کسی نے چادر ہٹا کر پیر ہلایا تو اس کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ فوزیہ اور رضیہ کھڑی تھیں۔ اس کی اپنی بہنیں۔ ماں جائی جن کی آنکھوں سے بہت سی شادمانیوں کے انتظار کی تھکن نمایاں تھی۔ انہوں نے بتایا کہ ابا جی کے بعد امی سخت بیمار رہنے لگی تھیں۔ شاہد بھائی راحیلہ بھابی کو لے کر نہ جانے کہاں چل دیئے پھر امی نے جانے ہی میں مصلحت جانی۔ دونوں اس پر جھک گئیں اور تینوں لپٹ لپٹ کر روتی رہیں۔ وہ تشنہ تھی۔ بے حد پیاسی۔ صرف کھویا ہی کھویا۔ پایا کیا تھا۔ بہت سی پریشان کن باتیں۔ اداس دن تنہا طویل راتیں۔ دکھوں کے بھنور، گرم جھلستی ہوا کے جھکڑ بے سایہ پن ساتھی کتنے ہیں۔ ساون کے اندھے کو ہرا ہی سوجھتا ہے۔ درخشاں کا ادراک بھی بدل گیا تھا۔ ہر وقت وہ دل دہلا دینے والے خواب دیکھا کرتی جس میں بے شمار زندگی کے دکھ بھی تھے جو احساسات کے آبگینوں کو کرچی کرچی کر ڈالتے۔ زندگی کے چوبیس سالوں میں اس نے کتنی طویل مسافت طے کر لی تھی۔ بہت سے پر پیچ اور دشوار ترین راستے۔ بہت سے نئے تجربات جن کی تمنائیں "ٹینی سن کے یولیسس" نے بھی نہ کی ہوگی جو زندگی کی تلچھٹ تک کو پی جانا چاہتا تھا۔ معاشرے نے اب تک اسے کیا دیا تھا۔ درخشاں کو کیا دیا تھا۔ اس کے اطراف ان گنت درخشائیں تھیں۔ افسردہ اور انتہائی غم و اندوہ میں ڈوبی ہوئیں

کیا یہی اس کا مقدر ہے۔ ہاں شاید یہی اپنی ٹھکرائی الم زدہ روتی بسورتی حسیناؤں نے ہی تو عظیم ادب جنم دیا ہے۔ اس کی ماں زرینہ خانم خود غریب والدین کی چھٹی صاحبزادی تھیں۔ جسے بیاہنے کے لئے نانا میاں کو اپنی جائداد تتر بتر کرنا پڑی۔ اور پھر خود بھی سات گڑیوں کو جنم دیا۔ جنہوں نے رہا سہا خون بھی چوس ڈالا۔ زیبو اس کی نئی نویلی خالہ ساماں جسے دیکھ کر منہ بند کلیوں کا تصور آتا تھا۔ اس کا شوہر اسے پیشہ کرانے پر مجبور کرتا تھا۔ کام کے دوران وہ زار و زار روتی تھی اور جب وہ طلاق کے لئے کہتی تو وہ چولہے میں ٹوٹی ہوئی لکڑیوں سے پیٹ کر آدھ موا کر دیتا ـــــ وہ کئی دنوں گھر گھر ہاتھ جوڑتی پھرتی اور اب ایک عرصہ سے اس کے متعلق قطعی کچھ علم نہیں ہی تھا۔

زبیدہ اپنے شوہر کی اولادوں کو کتنی دل جمعی اور محنت سے پال رہی تھی۔ جیسے اس کے اپنے ہوں لیکن وہ اب بھی پلنگ پہ لیٹے لیٹے چھڑی کی نوک چبھو کر اس سے کام لیتا تھا۔ اس کی چہیتی سہیلی سلمیٰ بغیر جہیز کی جھنکار کے فیاض کے پیچھے چلی آئی تھی اور سینی ٹوریم میں بستر مرگ پر پڑی تھی اور اس کی ساس بیٹے کو بیاہنے کی تیاریوں میں مصروف تھی۔ مسز فیض اب دیکھ رہی تھیں کہ مسٹر فیض اپنی سیکرٹری فلک صورتی سے بہت ہی بے تکلف ہوتے جا رہے ہیں تو وہ بھی نشانہ بنشانہ اپنے باس سے راہ و رسم بڑھا رہی تھیں۔

مس راحت جو کسی زمانے میں یونیورسٹی کی ہر دلعزیز طالبہ تھی کہ اس کے منگیتر کو مس ترنم نے اپنی سنہری تجوری کے مترنم سکوں کی جھنکار میں ان کے دل کو قید کر لیا تھا اور مس راحت نے شادی نہ کرنے کی قسم کھالی تھی اور دھڑا دھڑ ایم اے پہ ایم اے کر رہی تھی۔ یہ سب کیا ہو رہا تھا۔ سب منہ اٹھائے تیزی سے نہ جانے کہاں دوڑے چلے جا رہے تھے۔ جیسے ــــ ریس میں منہ زور گھوڑے کی باگیں ہاتھ سے چھوٹ گئی ہوں۔

یہ سارے اس کے اپنے غم تھے ــــ ایک عورت کا غم ــــ اتنا لا متناہی ــــ

بے انتہا لامحدود ۔۔۔ اس نے بے حد پیاری سی، اچھی سی اور خوب صورت سی دنیا بنانا چاہی جس سے دکھوں کی پیاس بجھ جاتی ہے۔ اس دنیا کی خوب صورتی کے لئے بے حد محنت کے بعد ذرا سا حسن جو یہ پیدا کر سکی یہی تھا کہ اس نے اپنی بہنوں کے ساتھ مل کر بیت الرحمت کی بنیاد ڈالی جو ستم رسیدہ ٹھکرائی ہوئی عورتوں۔ افلاس کے مارے اور محبت کے پیاسے بچوں کی جائے پناہ تھی۔ جہاں یہ سب بہنوں کی طرح نہیں۔ سہیلیوں کی طرح، ماں اور بچوں کی طرح نہیں بلکہ انسانوں کی طرح رہتی تھیں۔ جہاں ان کے بہت سارے بچے تھے اور بے حد پیارے سے۔ اس شام کسی کو معلوم نہ تھا کہ درخشاں پر کیا گزری۔ بس طویل مدت کے بعد ایک لفافہ اس کے نام آیا تھا۔ جب ٹرک کے المناک حادثے سے بچ جانے والا واحد پانچ سالہ بچہ بیت الرحمت میں آنے والا تھا۔ خواتین نے اس کے لئے چند نئے جوڑے سئے تھے۔ ننھے منے بچوں نے پھول چن کر ہار بنائے تھے۔ کیلے کے جھالردار پتوں کا ننھا سا گیٹ بنایا تھا۔ جس پہ گیندے کے پھولوں سے خوش آمدید لکھا تھا وہ لفافہ جو اس کے نام آیا تھا اب تک اس کے کوٹ کی جیبوں میں تھا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ رحمان کی تحریر معلوم ہوتی تھی۔ اس عرصے میں اس نے بڑے سکون سے نووارد ننھے کو کھانا کھلایا۔ کپڑے بدلوا کر سلوایا۔ پھر سب دیر تک گرم چنے اور مونگ پھلی گوبر کی دھیمی آنچ پر درمیان میں رکھے دلچسپ باتیں کرتی رہتی تھیں۔ انگیٹھی میں کوئلے دہک رہے تھے اس نے سونے سے پہلے راؤنڈ لیتے وقت چراغ کی مدھم روشنی میں لفافہ کھولا۔ یہ رحمان کی طرف سے طلاق نامہ تھا ۔۔۔ کیا یہی کافی نہ تھا کہ وہ اسے چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ اب اس نے انتظار کی چاہت بھی چھین لی تھی۔ زندگی کے تپتے صحرا میں بھٹکنے کے لئے چھوڑ دیا۔ تنکے کا سہارا بھی گوارا نہ کیا۔ وہ اس شب دیر تک بیت الرحمت" کے کمروں میں چکر کاٹتی رہی ۔۔۔ پھر ہر بستر کے قریب رک رک کر ان کے چہروں کو تکتی رہی۔ بیک وقت اتنی ساری معصوم زندگیاں اس کے سامنے تھیں۔ بہت سی شادیانوں کی

منتظر۔ اور کبھی کبھی فرد واحد کے وجود سے اور اس کی سچی لگن سے بیک وقت بہت سی زندگیوں میں انقلاب آجاتا ہے۔ اس نے شمسہ کی خوابیدہ آنکھوں پہ آہستگی سے انگلی پھیری کہیں یہ معمول کی طرح آج بھی بھیگی ہوئی تو نہیں ـــــ اور ننھے نووارد بھی جس کے والدین کل شام تک اس کے ساتھ تھے اور اچانک خون کے دہکتے سمندر میں ڈوب گئے تھے۔ اس کے گلے میں اب تک کلیوں کا ہار تھا۔ جو اسے ننھے ساتھیوں نے پہنایا تھا۔ درخشاں نے اس کی پیشانی چوم لی۔ یہ دکھ میرے اپنے ہیں ـــــ مجھے بے حد عزیز ہیں ـــــ اپنے دکھوں کی ابلتی نہروں سے خوشیوں کے باغوں کو سینچوں گی ـــــ اس نے جھک کر ساری مرجھائی ہوئی اداس کلیوں کو عقیدت سے گود میں بھر لیا۔

لیمپ ۱۹۶۷ء

پھولوں کی ہنسی

وہ نہ تو اتنی خوب صورت تھی کہ لڑکے مر مٹیں اور نہ اتنی بدصورت کہ ناک بھول چڑھائیں۔ نہ اتنی امیر کہ سب سونے کی چڑیا کو ہتھیانے کی کوشش کریں نہ اتنی غریب کہ کوئی قریب بھی نہ پھٹکے۔ لیکن اللہ میاں نے ہر چیز میں کوئی نہ کوئی خوب صورتی ضرور پیدا کی ہے۔ کون چاہتا ہے کہ کوئی اس کی تخلیق کو برا کہے۔ سو باتوں کی ایک بات نسرین کی ہنسی تھی۔ دانت سیپ کے سے بند ہونٹوں سے جھانکتے ہوئے موتی۔ پھر ایسی کھنک کہ ہر چیز مسکرا اٹھے۔ کلیاں چٹک کر پھول بن جائیں۔ گھٹاؤں میں بھی بجلی دوڑ جائے۔ فضا موسیقی سے لبریز ہو جائے اور جیسے خزاں رسیدہ خشک شاخوں میں نمی سی آ جائے۔ ایسے میں جی چاہتا کہ بس وہ ہنستی رہے۔ سدا ہنستی رہے۔ تو یہ ہوا کہ یہی ہنسی سارے محلے والوں کے لئے خطرے کی گھنٹی بن گئی اور وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ اس کی ہنسی کی لپیٹ میں آنے والا بمبئی والی محمودہ بیگم کا خوبرو بد دماغ لڑکا ریاض تھا جس پر سب نظریں جمائے بیٹھے تھے۔ اس نے ان دنوں سینئر کیمبرج کا امتحان دیا تھا اور ملک سے باہر

اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا چاہتا تھا کہ عین اسی وقت محمودہ بیگم کی مامتا اسے دولہا بنتے دیکھنے کے لئے تڑپ اٹھی اور ریاض بابو تھے کہ شادی کا لفظ بھی کانوں پر نہ پڑنے دیتے تھے۔ محمودہ بیگم کا دل خون ہو جاتا۔ شوہر کی بے وقت موت کے بعد یہ دوسرا بڑا غم تھا۔ مگر یہ سب کچھ کتنا عجیب تھا خود ریاض کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اس طرح کیسے ہو گیا۔ نہ جانے کیسے۔ کیوں؟ اس دن موسم بھی بے حد خراب تھا۔ آخری پیپر خراب ہونے کا اسے بار بار خیال آرہا تھا۔ مارے گرمی کے دم نکلا جا رہا تھا اس کے لگائے ہوئے جاپانی پودے کمہلا گئے تھے۔ وہ بے خبر نٹ کن کول کی دھن پر ٹانگ ہلا رہا تھا۔ اس کی ماں بڑے چاؤ سے اس کے لئے ٹھنڈا دودھ تیار کر رہی تھی کہ چھن چھنن سے کوئی چیز بج اٹھی۔

"ارے خالہ۔ واہ بھلا یہ کیا بات ہوئی۔" وہی آواز جیسے گھنگھروؤں کی چھنک پائل کی جھنکار۔ "ہائے خالہ یونہی شرمندہ کرتی ہیں۔ اتنا سا تو برف ہے کوئی آدھ سیر پانی خرچ ہوا ہوگا۔ وہ پانی ہم بھر لیں گے آپ کے نل سے۔" وہی ہنسی۔ وہ کھنچتا چلا گیا دھاگے میں بندھا میٹھا میٹھا رس اس کے کانوں میں گھل گیا وہ اس کی کھنک کی حظ میں ڈوب گیا۔ حالانکہ وہ اس لڑکی کو انتہائی احمق خیال کرتا تھا جو ہر وقت کا غذ اور کپڑوں پر بیل بوٹے پینٹ کرتی رہتی تھی اور فضول سی کتابیں پڑھتی رہتی تھی۔ نہ بال بنانے کا ڈھنگ نہ کپڑے پہننے کا سلیقہ اور بڑی سعادت مندی سے اپنے ابا جان کے سیر دابتے وقت نصیحت آموز کہانیاں سنا کرتی تھیں۔ لیکن اس کی ہنسی بھی کیسی تھی۔ جو۔ جو۔ اس نے ابھی ہنسی تھی۔

"ارے۔ کیا آپ کے منہ میں بتاشے ہیں یا ہارمونیم۔" وہ ایک دم سامنے آکر بولا۔

"تو یہ جی۔ آپ ہی کے منہ میں لگا ہو ہارمونیم۔ میرا ہی منہ رہ گیا تھا۔" پھر

ہارمونیم بجا اور وہ اس کی موسیقیت میں دھنستا چلا گیا۔

محمودہ بیگم کو کیا چاہیئے تھا۔ موقع سے فائدہ اٹھایا۔ بس جھٹ پٹ نسرین کو دولہن بنا کر اپنے گھر لے آئیں۔ چھوٹی سی ناک والی پیلی رنگت کی نسرین دلہن بن کر کانچ کی گڑیا لگ رہی تھی۔ اس قدر نرم و نازک۔ کہ جب ریاض نے کلائی پر رسٹ واچ باندھنے کے لئے آہستگی سے ہاتھ پکڑا تو اسے یوں لگا جیسے بلوریں کلائی کرچی کرچی ہو جائے گی کہ اسی لمحے جیسے منہ بند کلیاں نکھر گیئں اور جلترنگ بج گئے۔

"ارے آپ ۔ آپ کیسا ہنستی ہیں۔" وہ بچوں کی طرح منہ کھولے اسے دیکھ رہا تھا اور اسی لمحے ایک بار پھر جیسے بہت سی بلوریں پیالیاں ٹکرا گیئں اور جھکی جھکی نیم وا انتیس کلیاں ہنسی سے جل تھل ہو گیئں۔

محمودہ بیگم چپکے چپکے دیکھا کرتیں اور سوچتی رہ جاتیں۔ دلہن بھی کیسی ملی۔ ہر وقت کھنکتی بجتی۔

"کون سے کپڑے پہنیں جی ۔" نسرین نے پوچھا۔

"کون سے ہم ۔ کیریلین کی شرٹ اور ٹیریلین کا ڈوپٹہ اور ۔"

وہ ہنسی ۔ بہار آگئی۔

"یہ لیجئے بیگم ہو یا گھنگھرو ۔ ہر وقت بجتے ہوئے۔" وہ بے تحاشا اس کی جانب بڑھا۔

محمودہ بیگم کچھ کہنے کے لئے داخل ہوتے ہی واپس لوٹ گیئں۔

وہی مدھ بھری ہنسی اور گونجتا ہوا رسیلہ نغمہ۔

"کچھ دنیا کی بھی خبر ہے ۔" غڑاپ سے یہ جملہ پھر ہنسی میں ڈوب گیا۔

"تمہیں تو ہے ۔" ریاض نے ہاتھ روک لئے

"ہاں ہے جبھی تو کہہ رہی ہوں ۔ پتہ ہے ابھی کیا ہوا تھا۔

وہ پھر آگے بڑھا "یہی۔"

پھر ہنسی — وہ بے دم کھڑا جیسے آرکسٹرا کے جھنجھناتے سازوں کے بحر بیکراں میں غوطہ زن تھا۔ نسرین سیاہ بال سمیٹے اٹھ بیٹھی۔ "اماں جان آئی تھیں ابھی ابھی اور آپ ہیں کہ "

"ایں! تو کیا ہوا خوش ہو رہی ہوں گی میرے بچے کھیل رہے ہیں۔"

کلی کی مسکراہٹ کی ساعت کتنی طویل ہوتی ہے!"

کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات ———— کلی نے یہ سن کر تبسم کیا۔

ایک دن بھری بہار میں خمار آلود ہواؤں میں جب چٹک کر پھول بن جانے والی کلیاں سرنگوں تھیں۔ آم اور کیلوں کے پتوں میں عجیب سرسراہٹ تھی۔ ریاض نے باہر جانے کا اعلان کر دیا۔ صرف دو سال کی تربیت کے لئے۔ وہی جس کا سودا ایک عرصے سے سوار تھا۔ جاتے وقت نسرین نے ریاض کے لگائے ہوئے وہ نازک جاپانی پھول دکھائے تھے جن کی نگرانی وہ بڑے چاؤ سے کرتا تھا۔

"وہ پھول دیکھے ہیں؟"

"ہاں بلکہ سنے بھی ہیں کھلکھلا کر ہنستے ہوئے۔ وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرایا۔

"ان کی ہنسی کی مدت بڑی قلیل ہوتی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ جب تک تم آؤ مرجھا جائیں۔"

"ان کی ایسی تیسی " وہ بدستور نسرین کو دیکھ کر بولا۔

ریاض کو اپنے وہ تمام خواب پورے ہوتے نظر آرہے تھے۔ جب وہ ماچس کی ڈبیاں جمع کر کے ریلیں اور کاغذ کی ناؤ بنا کر کبھی خود کو ابن بطوطہ تصور کرتا تو کبھی جوزف کانریڈ۔ اور اب اسے تعلیم کے ساتھ گھومنے کا موقع ملا تھا۔ پہلے پہل وہ بہت اداس

رہا۔ یوں بھی اگر خواب حقیقت بن جائے تو اس کا سحر ٹوٹ جاتا ہے۔ پھر سب کو چھوڑنے کا غم ساتھ ہی نئی صورت حال کا مقابلہ اس نے بہت سارے خط لکھ مارے۔ اتنے جذباتی انداز میں کہ محمودہ بیگم اور نسرین رونے لگتیں۔ لیکن جب سیشن شروع ہوا اور وہ مصروف ہو گیا تو رفتہ رفتہ خطوط کی تعداد کم ہونے لگی اور پھر بے حد ہی کم۔ حتیٰ کہ تشکایتی خطوط کے جوابات بھی گول کرنے لگا۔ اس نے محسوس کیا باوجود تھوڑی محرومیوں کے۔ دنیا پھر بھی کافی حسین جگہ ہے۔ حسن لامتناہی ہے۔

I Love all beautiful things;

I seek and adore them.

محض حسن دیکھنے والی آنکھ اور محسوس کرنے والا دل چاہیئے۔ نسرین کی ہنسی میں چاہے کتنی ہی کھنک ہو۔ خلوص کا رچاؤ ہو محبت کی شیرینی ہو لیکن شرلے کی حاضر جوابی لیزا کا نکھرا نکھرا اشفاف پیکر، جامہ زیبی پُر وقار چال مس رابرٹ کی۔ موسیقیت آمیز شاعری میری پیٹر کی معلومات جو ڈسکشن کے دوران اُبل اُبل کر سب کو ڈبو دیتی ہیں کچھ کم حسین نہیں کہ سب بے حد دلکش باتیں ہیں۔ بے حد پیاری! محض کھنکتی ہنسی۔ کے بھنور میں پھنس جانا اسے مضحکہ خیز لگا۔ اس کا زیادہ وقت میری پیٹر شرلے اور مس رابرٹ کے ساتھ گزرنے لگا۔ پھر مکان کی بوڑھی مالکہ بڑی نرم دل عورت تھی۔ اس کا بے حد خیال رکھتی تھی جس کا جوان بیٹا حادثے میں ہلاک ہو گیا تھا۔

" مائی جم واز جسٹ لائیک یو! روز

" روز. Rose ہاؤ پریٹی۔

وہ ریاض کو روز (Rose) کہتی تھی۔ بھلا وہ کیسے نہ ایسی خاتون کو جی جان سے چاہنے لگتا۔ وہ اکثر نئی نئی چیزیں بھی پکا کر دے جاتی۔ ریاض اسے مما کہنے لگا تھا اس کے لئے بسکٹ کے پیکٹ خرید لاتا۔ کبھی کیڈبری چاکلیٹ اور کبھی چپس وغیرہ۔

مما خوشی سے پھولی نہ سماتی۔ اسے سب کچھ بھول جاتا۔ محبت بحر بیکراں ہے لیکن نہ جانے کیوں ہم نے قریبی مخصوص عزیزوں تک محدود کر رکھا ہے۔ مگر انسان کا المیہ یہ ہے کہ اس میں وسعت پیدا کرنے سے گہرائی میں کمی آجاتی ہے۔ ریاض کو یہاں دو سال سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا تھا۔ نت نئے تجربات نے اس کے ذہن میں عظیم تبدیلی رونما کر دی تھی۔ کبھی کبھی وہ محسوس کرتا کہ وہ کس قدر بے وقوف رہا ہے جو محض تخیلات کی دنیا میں رہ کر ہر شے کو دور سے دیکھنے کا عادی تھا۔ حقیقت کچھ اور ہی شے ہے۔ عجیب سی۔ نہ ہی بہت تلخ زہر ہلاہل کی طرح، اور نہ ہی خواب کی طرح سحر انگیز بلکہ حقیقت زندگی کا سلیقہ ہوتی ہے۔ جو خوشگوار بھی ہوتی ہے اور ناخوشگوار بھی۔ ان گنت روپہلے دن اور خیرہ کر دینے والی روشنیوں سے جگمگاتی راتیں جبلہ سرمستیوں میں گزرنے لگی۔ موسم بہار کی ایک رات پورے چاند کی روشنی میں وہ بیٹھا اوپن تھیٹر میں شیکسپیئر کے کئی بار دیکھے ہوئے ڈرامے ہملٹ دیکھ رہا تھا کہ اسی دوران پاس ہی بیٹھی ہوئی مس ملٹن پر نظر پڑی جو اس کے سامنے فلیٹ میں رہتی تھی اور اکثر سامنا ہونے پر مسکرا دیتی تھی۔ مگر ریاض نے توجہ ہی نہ دی تھی اور آج وہ اس کی درخواست پر ساتھ چلا آیا تھا۔ اسے حیرت ہوئی، وہ بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ چاند کی دودھیا روشنی میں نہائی ہوئی جیسے۔ ہملٹ کی محبوبہ اوفیلیا۔ اس کا دل چاہا کہ شیکسپیئر کی سونیٹ گنگناتا رہے۔

------Love is not love which alters,

When it alteration finds or bends,

With the remover to remove.

ایک دم اسے یوں لگا جیسے ہملٹ جذبات سے بے قابو ہو کر اوفیلیا پر پل پڑا ہے اور — پھر ڈھیر ہو گیا — کچھ دنوں بعد ہی میاں بیوی کی حیثیت سے رہنے لگے۔ یہ

کیسا انہونا حادثہ تھا۔ یہ سب نہ جانے کیسے ہوگیا تھا۔ اب وہ سلمیٰ ریاض تھی اور ایک فرمانبردار بیوی مگر کم گو اور بہت کم ہنسنے والی۔ زندگی کی ناؤ غیر متلاطم ساگر پہ دھیرے دھیرے بہتی کافی آگے نکل آئی تھی۔ جہاں بہت سی مسرتیں تھیں پنکی اور سویٹی بھی ان کی زندگی میں داخل ہو گئے تھے۔ مگر پھر بھی کچھ کم تھا۔ نہ جانے کیا؟ زندگی کے کینوس پر کوئی لکیر مبہم تھی کوئی رنگ کم تھا مگر کون سا۔ کون سا؟ متواتر دلکش طوفانوں کے بعد یہ کیسا جمود تھا۔ خوب صورت تصویر میں کون سا رنگ غائب تھا۔ نہ جانے کون سا؟ سلمیٰ ریاض بہت کم ہنستی تھی۔ پنکی اور سوئٹی بھی ناتواں اور کم ہنسنے والے بچے تھے۔ وہ تنگ آ گیا۔ آخر محمودہ بیگم کا وہی خود سر بے چین طبیعت کا ہی لڑکا تھا۔ سابق چیف جسٹس کا اکلوتا بیٹا۔ سلمیٰ ایک معمولی سی لڑکی تھی۔ پھر وہ بہت کم ہنستی تھی۔ ایک شام اتنی لڑائی ہوئی کہ وہ دونوں بچوں کو چھوڑ کر چلی گئی۔ ممانے اس کی دلجوئی کے لئے کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ ریاض نے میز کی درازوں سے ڈھیروں خطوط نکالے جو بغیر پڑھے ڈال دیا کرتا تھا۔ دو دن گھر میں بند رہا اور ماں اور نسرین کی طرف سے آئے ہوئے بے شمار خط بار بار پڑھتا رہا۔ اور بے حد جذباتی ہو گیا۔ مدھر ہنسی کی آواز اس کا احاطہ کئے بے چین کرتی رہی۔ رات بھر وہ روپہلی گھنٹیوں کی کھنک سنتا رہا۔ شفاف پانیوں میں سیپ میں ٹرل ٹرل پانی کو نکلتے داخل ہوتے دیکھتا اور سنتا رہا۔ آوازوں کے خوب صورت دیس میں نہ جانے کہاں کہاں!

تیسرے دن ریاض جونہی پلین سے اترا۔ گڑھی شاہو کے تانگہ میں سوار محمودہ منزل کے سامنے آکر رکا۔ سامنے ہی صحن میں ایک خاتون سفید ساڑھی میں ملبوس جھکی آلو چھیل رہی تھی۔ سیاہ گھمبیر بالوں میں سفید بال چمک رہے تھے وہ اسے دیکھ کر ایک دم کھڑی ہو گئی پھر جھجک کر پیچھے ہٹی اور ساڑھی کا آنچل سر پہ رکھ لیا اور عجیب خواب کی سی کیفیت میں دیکھا۔

"آپ۔ کہیں آپ تو نہیں ؟"

"ہاں نسرین میں ہی ہوں۔"

"ارے تو اتنے اجنبیوں کی طرح کیوں کھڑے ہوئے ہیں۔" وہ عین ریاض کی توقع کے مطابق کھلکھلا کر ہنسی اور آگے بڑھ کر بیگ تھام لیا۔ لیکن اس ہنسی سے نہ تو اس کے کانوں میں رس گھلا نہ دل میں اتر جانے والی کھنک پیدا ہوئی۔ نہ ہی گھٹاؤں میں برق لہرائی۔ نہ خشک شاخوں میں نمی سی آئی۔ اسے وہ مصنوعی جذبات طاری کرنے والی ہیروئن معلوم ہوئی۔ اس نے سوٹ کیس کیاری کے پاس رکھتے ہوئے افسردگی سے دیکھا۔ جس میں اس کے لگائے ہوئے پھولوں کی جگہ ٹنڈ منڈ مٹیالی شاخیں ایستادہ تھیں۔ ہر پھول ایک بار۔ صرف ایک بار پوری رعنائی اور دلآویزی سے مسکراتا ہے۔ ایسے ہی لمحات میں اگر وہ مخفی رہ جائے تو اس کی قربت التفات چھن جائے تو یہ کتنے المیے کی بات ہے کہ وہ لمحات نہایت سبک روی سے کھسک جاتے ہیں۔ اس نے نسرین کے زرد چہرے اور تھکن سے چور بے جان آنکھوں کو دیکھا۔ اس کا اپنا سارا کرب و اذیت جو اس کی روح کو بے چین کئے دیتا تھا نسرین کی آنکھوں میں ساکن تھا۔

ستمبر ۱۹۶۸ء

جن

تایا ابا نے جونہی گھر کی چوکھٹ میں قدم رکھا نانی جان اور شہزادی بیگم کی آوازوں کے ساتھ اپنے بچوں اور عورتوں کی بہت سی آوازوں نے ہلہ بول دیا۔ ان کے نتھنے خطرات کی بو سے پھڑپھڑائے۔ انہوں نے سامان وہیں کونے میں رکھوا دیا، سفید براق کرتے کو جھاڑا اور لاٹھی ٹیکتے ہوئے رعب اور طنطنے سے آگے بڑھے۔ چند بچے دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑے ہو گئے۔ بوسیدہ برقعوں والی دو عورتیں تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی باہر نکل آئیں۔ اور میں چوہیا کی طرح دبک کر تخت کے پیچھے جا بیٹھی۔ گھر کی فرسودہ سیاست کا تعفن بری طرح پھیل رہا تھا۔ سامنے پیپل کے درخت پر شہزادی بیگم کی جگنوؤں والی لال چندری اور فیروزی ساٹن کی شلوار ادھ جلی لٹکی ہوئی تھی۔ اور نیچے کچھ ہڈیاں بڑے سلیقے سے ایک پلیٹ میں سجی رکھی تھیں۔ تایا ابا کی سرخ و سپید پیشانی پر تیوریاں ناگنوں کی طرح لہرائیں۔ نتھنے پھیل گئے اور آنکھوں میں آگ بھر گئی۔

سامنے ہی شہزادی بیگم تخت پر بے جان سی بیٹھی روئے جا رہی تھی۔

"دلہن! اب یوں جان ہلکان کرنے سے کیا ہوگا۔ صدقے کتنے پیچھے پڑ گئے ہیں۔

تیرے باپ تو مولوی ہیں انہی سے کیوں نہیں کوئی تعویذ لے لیتیں،، تائی جان ٹھنڈے پانی کا گلاس لئے بیٹھی تھیں۔ ''ہونہہ تو پھر جنوں والا قصہ ہے۔'' تایا ابا عین شہزادی کے سر پہ کھڑے تھے۔

''ریاض کی ماں اب کے بتا جن کیا کیا لوٹ لے گئے۔ تایا ابا نے یہ پوچھتے ہی لاٹھی اس طرح گھمائی جیسے چاہتے ہوں کہ اس سے اپنی بہو کا سر پلپلا دیں۔ تائی جان ان کی غیر متوقع آمد سے حیران ایک دم تکے جا رہی تھیں پھر مونڈھا بڑھا کر بولیں۔

''وہی کرماں والے۔ اجاڑ لے گئے گھر۔ دلہن کے تین بھاری جوڑے لے گئے بکس میں ہڈیاں پڑی ملی ہیں۔ کچھ کپڑے پلنگ پر رکھے تھے وہ جلے پڑے ہیں۔ رات اتنی پریشانی میں گزاری ہے۔ کتنے انگ رات بھر بھونکتے رہے۔ پھر اب صبح سے دلہن کو غش پہ غش آ رہے ہیں۔ کرماں والا کچھ کہتا ہے اسے۔ مجھے تو سنائی نہیں دیتا۔ کہتی ہے بڈھا ہے۔ ریاض کے ابا آپ ہی جائیے مولوی صاحب کے پاس اب تو۔۔۔''

''تائی جان ایک ہی سانس میں کہے جا رہی تھیں۔

شہزادی بیگم نے رو رو کر آنکھیں سجا لی تھیں۔ ناک سرخ انگارہ ہو رہی تھی۔ رخساروں پر شفق پھوٹ رہی تھی۔ سیاہ بالوں کی لٹیں مرمریں پیشانی پر کروٹیں لے رہی تھیں۔ ہونٹ تک دہک رہے تھے۔ ''جبھی تو جن آتے ہیں اس پر۔'' تایا ابا نے شہزادی بیگم کو اس حالت میں دیکھ کر سوچا۔ یہ ان کا غصہ نہ جانے کہاں رفو چکر ہو گیا تھا۔ سمندر کی موج کی طرح جو گھر داخل ہوتے ہی ابھری اور شہزادی بیگم کو یوں دیکھتے ہی ٹوٹ گئی تھی۔

''جوڑے تو اب کیا بنیں گے نصیب ہی سدا سے بُرا ہے۔'' تائی جان نے لسّی سے بھرا گلاس تایا ابا کی طرف بڑھایا اور ایک دم چونکیں۔ ''ریاض کے ابا۔ وہ سیف بھی احتیاطاً دیکھ لینا۔ کل صبح کھلی تھی۔ آج صبح بند دیکھا۔ نہ جانے میرا وہم ہے یا انہی

کرسیاں والوں کے کارنامے۔ کل دن میں بھی چھوٹے چھوٹے کنکر آتے رہے۔ تایا ابا لسی کا گلاس وہیں چھوڑ سیف کے سامنے کھڑے تھے۔ ڈھائی ہزار کی رقم غائب تھی۔ چند بکھرے ہوئے سکے منہ چڑا رہے تھے۔ انہوں نے لاٹھی زور سے گھما کر زمین پر دے ماری۔ "دولہن بیگم!" پوری عمارت کانپ اٹھی۔ "دیکھ میں تیرا کیسے جن نکالتا ہوں۔ تجھے معلوم نہیں جن نکالنا کیسے ہے۔" انہوں نے دانت پیس کر دیکھا اور پھر آس پاس رکھی ہوئی چیزوں کو اٹھا کر پھینکنا شروع کر دیا۔ چابیاں سیدھی نانی جان کی گود میں جا گریں۔ کرسیاں چیخیں، پیڑھیاں چلائیں، مونڈھے لڑھکتے ہوئے سارے صحن میں پھیل گئے۔ شیشیاں، ڈبے اور برتن کھڑکھڑاتے اوندھے منہ جا گرے اور پھر تایا ابا نڈھال ہو کر چارپائی پر گر پڑے۔ ہائے یہ تایا ابا پہ سوار جن تو سب سے زیادہ خطرناک ہے۔" میں نے سہم کر سوچا اور طرح طرح کی یاد کی ہوئیں دعائیں پڑھ ڈالیں۔ پھر جنوں کو انہتائی پیارے ناموں سے پکار کر کہتی رہی کہ مجھ پر سوار نہ ہوں۔ میں ہمیشہ عزت کرتی رہوں گی ان کی۔ نانی جان اپنا خون آلود پیر سہلاتی زخمی شیرنی کی طرح تایا ابا کو گھور رہی تھیں اور دلہن بیگم پیلپ کی اوٹ میں بلی کی طرح مسمی شکل بنائے بیٹھی تھیں۔

جنوں کا یہ تیسرا غیر متوقع اور سب سے زیادہ سخت حملہ تھا۔ اس زمانے کے تو جن بھی نرے بزدل تھے۔ ہمیشہ تایا ابا کی غیر موجودگی میں آ کر ستاتے تھے اور چیزیں اڑا لے جاتے تھے۔ کبھی دلہن بیگم کے کپڑے اور کبھی کوئی گہنا اور کبھی سنہری گڑ کی ڈھیلیاں۔ ایک دادا جان کے زمانے کے جن تھے منہ در منہ شرارت کرتے تھے پھر معافی بھی مانگ لیتے تھے۔ خود تایا ابا اور نانی جان نے کئی باتیں بنائی تھیں۔ اچانک رسی پر دھلے کپڑے آگ پکڑ لیتے یا حقے کی چلم اچانک زمین پر آن گرتی یا آگ پر رکھی ہوئی ہنڈیا کا سارا گوشت غائب ہو جاتا لیکن جب وہ داداجان کے رعب سے واقف ہو گئے تو ان کی کبھی ہمت ہی نہ ہوئی پہلے خود آ کر داداجان سے قرآن شریف پڑھتے رہے پھر اپنے بچوں کو بھی لانے لگے۔ آخری دنوں میں انہوں نے دادا ابا

کی بڑی خدمت کی۔ رات ٹانگیں دبانے۔ صبح ان کی آنکھ کھلنے سے پہلے ہی چلم میں آگ بھر دیتے
گھر صاف ستھرا کر جاتے۔ سردیاں ہوتیں تو پانی بھی گرم ملتا۔ خود دادی جان وقتاً فوقتاً کام
کروالیتیں وہ وضو کر کے دو پٹے کی بکل مار کر سیمنٹ والے کمرے کے کونے میں منہ ڈال
کر با آواز کہتیں "دو کرم دین اپنے آقا کے کپڑے دھو دینا آج فضلاں نہیں آئے گی۔ بیمار
ہے اور تھوڑی دیر کے بعد دادا جان کے کپڑے رسیوں پر سوکھنے کے لئے ڈال دیئے جاتے۔
تائی جان کے ساتھ جنوں والا قصہ خاندان بھر میں مشہور تھا۔ بات ہی کچھ ایسی
تھی کہ تائی جان اپنے زمانے کی حسین ترین عورت تھیں۔ کٹورہ سی آنکھیں، ابروؤں کے خم انہی
کمانوں سے نکلے ہوئے آنکھوں کے تیر ہی تو تایا ابا کے دل میں پیوست ہو گئے تھے۔ سرخ
سفید رنگت اس پر ایک دن وہ کھلے صحن میں کھٹولی کی اوٹ میں نہانے لگیں تایا ابا اندر
سو رہے تھے کہ اچانک اٹھ بیٹھے اور باہر چلے آئے۔ دیکھا تو آپ ہی آپ کنویں سے پانی کا
بوکا بھرا، پانی کی مشک، آن کر تائی جان پہ الٹ جانا اور دبے دبے قہقہے ابھرتے۔
وہ زور سے اللہ کی واسطہ دے کر دھاڑے تو نگوڑی اور کرتے کی ذرا سی جھلک دکھائی
دی۔ انہوں نے تائی جان کو بالوں سے پکڑ کر ایسا مارا کہ ان کے ہونٹ آہستہ سے پھڑپھڑائے
اور بالکل مردانہ آواز میں جن بکتا رہا۔ میاں جی معاف کر دو۔ اب بالکل نہیں آؤں گا۔
پھر اس نے ناک رگڑی اور وعدہ کیا کہ آپ کی سات پشتوں تک کو کبھی نہیں ستائے گا۔
تایا ابا بھی فوراً پہچان گئے تھے۔ شمے جن کو پیپل والے نور دین کے خاندان سے تھا اور یہ
خاندان بھی دادا جان کا دم بھرتا تھا۔ تائی جان کے پٹ پٹا کر جب حواس درست ہوئے
تو کہتی رہیں "مرن جوگا اب ادھر کا رخ تو کرے" میں خود چمڑی ادھیڑ کر نہ رکھ دوں تو"
نہ معلوم وہ کس جن کو کہہ رہی تھیں۔ تایا ابا نے اگرچہ دادا جان کی طرح جنوں کو تعلیم نہ
دی تھی اور نہ ہی جنوں پر قابض ہونے کا دعویٰ کیا تھا۔ تاہم جن نکالنے کے فن سے واقف
تھے اسی لئے شمے جن نے پھر ادھر کا رخ ہی نہ کیا۔ قد و قامت اور ڈیل ڈول میں تایا ابا

خود بھی جنوں سے کچھ کم نہ تھے۔ سات فٹ قد، سرخ و سپید رنگت اس پر کڑکڑاتی سفید چادر باندھے۔ کرتے پر سیاہ صدری پہنے سر پہ کلف دار پگڑی۔ جب چلتے تو تنومند جوان تک رشک کرتے اور حسد میں مبتلا ہو جاتے۔ محلے کی عورتیں اور مرد دونوں اکثر ان سے جن نکلواتے تھے۔ پہلے تو وہ جن زدہ مریض سے تفصیلی بات چیت کرتے اور لانے والوں سے بھی سوال کئے جاتے پھر ایک الگ کمرے میں لے جاتے جہاں کسی کو اندر آنے کی اجازت نہ ہوتی۔ اس کے بعد کمرے میں شور و غل بپا ہو جاتا۔ طرح طرح کی بے ہنگم آوازیں آتیں جیسے دھوبن کپڑے پٹخ رہی ہو یا دھنیا روئی دھن رہا ہو یا گھوڑا بان گھوڑے پر چابک چلا رہا ہو یا جیسے ایک دم بہت سے گھوڑے کمرے میں دوڑ لگا رہے ہوں یا جیسے کوئی ایک تیز رفتار انجن ٹکرا گئے ہوں پھر اچانک سناٹا چھا جاتا اور جن اتر جاتا۔ باہر نکلنے پر مریض سے لاکھ پوچھا جاتا جن کس طرح اترا لیکن وہ سر جھکائے گھر کی جانب چل دیتا اور زیادہ رولیعت مریض مکا دکھا کر کہتا "دُکس کمبخت پر جن سوار تھا۔ طبیعت تو ٹھیک ہے۔ ایک بار مریاں کی لڑکی پتہ نہ جانے کیسا جن سوار ہوا تھا کہ تایا ابا نے مریاں سے کہا تھا تو جلدی سے اس کی شادی کر ڈال ورنہ تیری خیر نہیں۔ نیند و کہتی تھی مریاں کی لڑکی نے ایک دفعہ پتے کی کھوٹی (کنوواں) سے نہا کر موتیا کے پھول بالوں میں لگائے تھے اور کانوں میں پہنے تھے اسی لئے اس پر جن آگئے تھے۔ ہونہہ! تو امی اسی لئے تو کہتی ہیں کہ کنواریاں خوشبو نہیں لگاتیں جن آجاتے ہیں۔ ہر وقت کی ایسی باتیں سن کر ایسے ڈراؤنے خیال آتے کہ نیند کوسوں دور بھاگ جاتی۔ اللہ میاں اس سے بہتر تھا کہ ہم بھی جن ہی ہوتے یہ نامعقول انسانوں پر ہی کیوں آتے ہیں پھر آنے کے ذرا ڈھنگ ملاحظہ ہوں۔ خوب صورت اور جوان عورتوں پر اور ان کی قیمتی اشیاء پر۔ نیند و کہتی تھی جن خود بھی بڑے خوب صورت ہوتے ہیں۔ گورے گورے، پیلے پیلے کپڑے پہنتے ہیں۔ موتیا کی کلیاں دے جاتے ہیں۔ ایک دن جھولی میں بہت سی کلیاں لئے کہتی تھی "فضل جن دے گیا ہے۔" پر تو تو کہتی تھی خوب صورت لڑکیوں پر آتے ہیں۔ میں نے اسے دیکھ کر بے ساختہ کہا۔ اس پر وہ دیر تک روتی

رہی تھی اور میرے کچھ بھی نہ پلے پڑا۔

مجھے اتنا ضرور معلوم تھا کہ تایا ابا زبردست مرد ہیں انہیں جنوں کی نئی نسل ہرگز پسند نہ تھی جوان کی غیر موجودگی میں فضول حرکتیں کرتی تھی۔ جنوں کا یہ نیا سلسلہ تو اس وقت شروع ہوا جب نانی جان ریاض میاں کی دلہن شہزادی بیگم کو بیاہ کر لائیں۔ شہزادی بیگم کے آتے ہی ایک بار پھر جنوں نے یہ گھر دیکھ لیا تھا۔ شہزادی بیگم اگرچہ بظاہر نانی جان کی طرح تو خوب صورت نہ تھیں لیکن ادائیں اتنی تیکھی تھیں کہ ریاض میاں تو کیا خود تایا ابا کی زبان پر آتے ہوئے شکایتوں کے پلندے واپس حلق میں جا گرتے۔ وہ اسی محلے کے عالم دین کی لڑکی تھی اور انہیں جھٹ پٹ نانی جان ہی بیاہ لائی تھیں عالم دین جواب مولوی صاحب تھے۔ انہوں نے اسی شہر کے پرائمری اسکول سے چار جماعتیں پاس کی تھیں اور اپنے شاگردوں کے ہر بار کلے مروڑنے پر کہتے۔ "اس زمانے کی چار اس زمانے کے بی۔ اے کے برابر ہیں۔" باپ قصائی تھا اور کند چھرے سے بڑھے بکرے ذبح کرتا تھا۔ یہ چونکہ بے حد نرم دل تھے۔ بکرے کی میں سنتے ہی لرزہ طاری ہو جاتا تھا اس لئے باپ کا پیشہ نہ اپنا سکے قریب ہی کی مسجد میں قرآن شریف پڑھا لیکن وہاں بھی جنوں کا راج تھا۔ کوئی مولوی صاحب دو تین دنوں سے زیادہ قیام نہ فرما سکے۔ اس طوائف الملوکی میں جوں توں قرآن شریف اردو ترجمہ کے ساتھ پڑھا جن کسی کے قبضے میں ہی نہ آتے تھے وہ جگہ جگہ گندگی پھیلا جاتے۔ مسجد کی چٹائیاں اور لوٹے غائب ہو جاتے۔ غسل خانوں میں رونگٹے کھڑے کر دینے والے جملے لکھے جاتے لیکن عالم دین مولوی صاحب بن کر اسی مسجد میں آئے اور جنوں کا قلع قمع کر دیا۔ شام ہوتے ہی بھر بھر حلوے کے ڈونگے اور جلیبیوں کی سینیاں مولوی صاحب کے ہاں آنے لگیں پھر بچے بھی دونوں وقت قرآن شریف پڑھنے کے لئے آنے لگے لیکن جنوں کی مخلوق ہے زبردست کیا ہوا کہ مولوی صاحب پہ بھی جن آنے لگے بچے مسجد جانے سے کترانے لگے۔ چند ایک نے ہمت کر کے امیوں کو بتلایا کہ مولوی صاحب پہ جن آنے

ہیں۔ وہ پڑھاتے پڑھاتے ایک دم چیخ کر اٹھ جاتے ہیں اور اپنے کپڑے اتار کر پھینک دیتے ہیں پھر چت لیٹ کر بچوں سے جسم دبواتے ہیں۔ اتفاق سے یہ ساری باتیں تایا ابا کے علم میں نہ آسکی تھیں ورنہ جن نکالنا تو ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ اب شہزادی بیگم پر جن آنے لگے تھے توبہ! یہ جن بھی اچھی خاصی پرسکون زندگی میں کیسی واہی تباہی مچادیتے ہیں۔ لیٹے لیٹے جو کبھی خیال آجاتا تو ہاتھ پیر سُن ہو جاتے۔ بھیجے میں بچھو ڈنک مارنے لگتے۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا پھیل جاتا اور جسم سے روح سرکنے لگتی انسانی زندگی میں جن نہ ہوتے تو وہ یقیناً بہت ہی خوشگوار ہوتی۔

شہزادی بیگم کو بیاہ لانے کے بعد پہلی بار جب تایا ابا لائل پور اپنی زمینیں دیکھنے گئے تھے تو ایک شام تائی بیگم جو کسی کام سے اندر گئیں تو دیکھا کہ شہزادی بیگم بال کھولے بیٹھی ہے اور آنکھوں میں وحشت ہے۔ انہیں دیکھتے ہی اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ''اماں جی میں لٹ گئی۔ ذرا یہاں دیکھئے تو! آدھا زیور غائب تھا۔ بسنتی چادر اور گوٹا لگا سوٹ جگہ جگہ سے جلا پڑا تھا۔ گوشت کا ٹکڑا بکس کے پاس ہی پڑا تھا۔ شہزادی بیگم کے آنسو یوں رواں تھے جیسے ساون بھادوں کی جھڑی۔ تائی جان نہ جانے کیا کیا پڑھ کر پھونکتی رہیں۔ تایا ابا کو واپس آنے پر معلوم ہوا تو دانت پیستے ٹہلتے رہے۔ پھر اتنا کہا۔ ''میں تیرا پتہ معلوم کرلوں گا۔'' کچھ دنوں کے بعد کھڑکی کے پاس پڑے بکری کے سینگ ملے اور صبح صبح شہزادی بیگم کے کمرے کے سامنے بڑے مٹی کے ڈھیلے ملتے، تایا ابا بہت کھوج لگاتے رہے لیکن جن ہاتھ نہ لگتے تھے۔ یہی کارروائی محلے کے دوسرے گھروں میں بھی ہوتی رہی۔ رسولن کے سرہانے رکھی ہوئی بالیاں اچانک غائب ہو گئیں۔ دوسرے دن پھر وہیں رکھی مل گئیں۔ چند سال اطمینان سے گزر گئے۔ جنوں کا نام و نشان نہ رہا۔ دوسری بار پھر تایا ابا کو باہر جانا پڑ گیا اور ایک مہینہ باہر رہے۔ واپسی پہ پھر جنوں کی کٹی ایک وارداتیں سنیں اور شہزادی بیگم ریاض احمد کے دکھواتے ہوئے دو ہزار روپے جنوں کے حوالے کرچکی تھیں۔ واپسی پہ تایا ابا نے یہ سنتے ہی شبیر محمد سے

شہزادی بیگم کو چھمکیاں لگوائیں۔ شہزادی بیگم کی آنکھوں میں وحشت بھر گئی۔ ہونٹ عجیب طریقے سے پھڑ پھڑاتے اور مردانہ آواز میں کوئی بولا "آئندہ نہیں کروں گا۔ اس دفعہ معاف کر دو۔ مجھے بے حد ضرورت تھی۔" اور وہ چلا گیا۔ تایا ابا آواز ہی نہ پہچان سکے۔ لیکن سب کہتے تھے کہ شہزادی بیگم کا اتارا ہوا جن باری باری محلے کے کسی نہ کسی گھر میں قیام کر لیتا ہے۔ اور اہل مکیں کو پریشان کرتا ہے۔ اس کے بعد معلوم ہوا کہ مسجد میں جا اترا ہے اور مولوی صاحب کو پریشان کرتا ہے۔ بچوں نے وہی شکایت دہرائی تو والدین نے انہیں ڈانٹ دیا۔ اس پر مولوی صاحب پر جن تو آتا لیکن چند ایک لاوارث بچوں کے سامنے جو زیادہ تر مسجد میں ہی رہتے تھے۔ ان بچوں کی آنکھوں میں دہشت اور حیرانی بڑھتی گئی۔ اور ان کے چہرے سفید پڑنے لگے لیکن سب کی آنکھوں پر جنوں کا دبیز سایہ تھا۔

ایک عرصے کے بعد اب پھر جب وہ باہر گئے تھے تو جنوں نے ان کی عدم موجودگی میں نقصان پہنچایا تھا۔ وہ پڑے پڑے کروٹیں بدلتے رہے۔ شام کھانا بھی نہ کھایا۔ رات بھر نہ جانے کہاں رہے۔ تائی جان اور شہزادی بیگم کی سٹی گم تھی۔ وہ دیر تک سجدے میں پڑی دعائیں مانگتی رہیں۔ نام لکھوا کر لوٹا بھی پھرایا لیکن کسی نام پر بھی لوٹا نہ گھوما۔ آج کل کے توکرمال والے بھی ایسے ہیں کہ پتہ نہیں چلتا، ایک ہمارے زمانے کے تمہارے بڈھے سسر منٹوں میں معلوم کر لیتے تھے۔ تائی جان پانی بھرا لوٹا رکھ کر دوبارہ وضو کے لئے اٹھ کھڑی ہوئیں اور شہزادی بیگم جا کر سو رہیں۔

تایا ابا پر نئی نسل کے جنوں کا کھوج لگانے کا جن سوار تھا لیکن وہ انہیں شکست پر شکست دیئے جاتے تھے۔ چند دنوں کے بعد زندگی پھر معمول پر آگئی۔ جن غائب ہو گئے تھے۔ نہ تو شہزادی بیگم نے شکایت کی اور نہ ہی تایا ابا نے مڑ کر پتہ کیا لیکن تایا ابا کے باہر جانے کے دن پھر قریب آرہے تھے۔ انہیں جلد ہی ضروری جانا تھا۔ اس لئے ایک شام وہ اچانک چلے گئے پہلی رات خیریت سے گزر گئی۔ دوسری شام تائی جان نماز پڑھ رہی تھیں اور شہزادی بیگم

وضو کر رہی تھیں کہ چھت پر کسی کے چلنے کی آواز آئی پھر جیسے قریب ہی کوئی ہانپ رہا تھا۔ نانی جان نے سلام پھیر کر شہزادی بیگم کو دیکھا تو وہ انہی کی طرف آ رہی تھی۔

"اماں جان آپ نے کچھ دیکھا"، شہزادی بیگم جائے نماز پر بیٹھ گئی۔

"ہاں کچھ آہٹ محسوس ہوئی تھی۔ میں سمجھی ہوا سے ڈالیاں ہل رہی ہوں گی۔"

"اوں ہونہہ اماں۔ وہ تھے سفید کپڑوں میں۔"

"ہاں؟ آہٹ سے دو ہی لگے تھے اور جیسے ہانپ رہے تھے۔ نانی جان سینے پر ہاتھ رکھ کر بولیں۔

"حوصلہ رکھئے اماں۔ مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے ہاتھ جوڑ معافی مانگتے ہوں۔"

"اچھا۔"

"ہاں۔ بارعب تھے۔ سفید داڑھی نورانی چہرے۔ ہاتھوں میں تسبیح۔ ڈرنے کی بات نہیں۔" شہزادی بیگم نے تسلی دے کر نماز کی نیت باندھ لی۔ نانی جان دیر تک جائے نماز پر بیٹھی رہیں۔ نہ جانے کب نیند آ گئی اور وہیں سو رہیں۔

تاریک آسمان پر اکا دکا ستارے چمک جاتے۔ دسویں کا چاند سنگترے کی پھانک کی طرح لگتا تھا جو بار بار بدلیوں میں جا چھپتا۔ کہ چھت پر سے اچانک ایک سیاہ سایہ کودا۔ اور اس کے پیچھے ایک اور سایہ شہزادی بانو کے کمرے میں داخل ہو گیا اور سرعت سے دو چار چکر لگائے پھر کوئی چیز ہلکے سے بجی۔ اس کے بعد جیسے کوئی چیز گھسیٹی جا رہی ہو۔ دوسرا سایہ سائے کی طرح پہلے سائے کے پیچھے لگا رہا۔ اندھیرے میں دو سائے آگے پیچھے دوڑتے رہے۔ سب گہری نیند سو رہے تھے پھر اچانک دونوں سائے ٹکرا گئے ہلکی سی چیخ بلند ہوئی اور پھر سناٹا چھا گیا۔

صبح تایا ابا نے اپنے صحن میں محلے بھر کے لوگوں کو جمع کر لیا تھا اور گرجدار آواز میں اعلان کیا کہ مشہور و معروف جن کو قبضہ میں کیا جا چکا ہے اور اس جن کا جن آج ہی سب کے سامنے

اتاروں گا۔ شہزادی بیگم بے حد خوف زدہ تھی۔ صبح سے اس نے کچھ نہ کھایا تھا۔ سب کے دل دھڑک رہے تھے۔ تائی جان بھی دیکھنے کوٹھے پر جا چڑھی تھیں۔ تایا ابا بدستور پگڑی سر پہ جمائے لاٹھی ٹیکتے دندناتے ہوئے پچھلی کوٹھری میں گئے اور چادر میں لپٹے ہوئے سائے کو کنارے سے کھینچتے ہوئے لا کر یوں پھینک دیا جیسے مرا ہوا چوہا۔ جونہی چادر ہٹی سب نے دیکھا مولوی صاحب سر جھکائے بیٹھے ہیں اور تایا ابا مجھے بہت بڑے جن معلوم ہوئے۔

افکار۔ ۱۹۶۸ء

خوابوں کے سفر میں

ہاں یہی کالج ہے۔ عام معمولی سی عمارت۔ چھوٹا سا گراؤنڈ۔ طویل برآمدے لیکن یہ میرا کالج ہے۔ میرا اپنا، مضبوط پیلی دیواروں اور لوہے کے جنگلوں والا جو شام کی دھوپ میں نہا کر سونے کی طرح دمکنے لگتا ہے جیسے مداس نے چھو لیا ہو! معبدہ گاہوں کی طرح پاک و مقدس۔ فقیر کی کٹیا کی طرح پُر خلوص اور پُرسکون! اس گھر کی طرح جس میں انسان بستے ہیں اور وہ انسانوں میں بستا ہے جو پردیسی کے دل میں فروزاں دیا بن کر آنکھوں میں لرزتا ہے۔ جیسے کوئی خوب صورت دیس میں آنے والے نووارد سے پوچھ بیٹھے۔ تم ہی بتاؤ اس سے زیادہ خوبصورت دیس بھی کوئی دیکھا ہے؟ یہ معصوم بچوں کی طرح کلکاریاں مارتا پانی۔ مور کے پروں جیسی رنگین پہاڑیاں۔ شوخ پیلے روغنی اور کاسنی پھولوں کی پھوار، قوس و قزاح کی پٹی۔ روپہلی دھوپ کی کرنوں میں نہائی ہوئی رنگ بکھیرتی برف اور تتلیوں کا جھرمٹ۔ اس سے زیادہ خوب صورت مقام کوئی ہو سکتا ہے اجنبی؟

ہاں۔ ہے دوست! مسافر کی تھکی ہوئی آنکھوں میں موتی آنسوؤں گوشوں میں ٹھہر جاتے ہیں۔ وہ مقام۔ میرا گھر ہے۔ سب سے زیادہ خوب صورت۔ حسن ہمارے اندر ہے۔ وہ نہیں جو ظاہر ہیں ہے۔"

اپنا کالج بھی اپنا گھر ہوتا ہے جو اندر ہی اندر اپنی جگہ بنا لیتا ہے جس میں کہ اپنائیت کا شیش محل جگمگاتا ہے۔ پیار کے سوتے پھوٹتے ہیں جس کی یاد زندگی کے آخری لمحوں تک رہتی ہے۔ بچے کے اس خواب کی طرح جس میں وہ مٹھائی سے بھری سینیاں لئے بیٹھا ہوتا ہے اور کھانے کا مشتاق کہ اسی لمحے خواب ٹوٹ جائے۔ گیٹ کے پاس ہی دیو قامت چوکیدار کھڑا رہتا ہے جو پہلی منزل پر کھڑی لڑکیوں کو ہاتھ سے پرے ہٹا سکتا ہے۔ گیٹ کے پاس ہی پھولوں کی کیاریاں ہیں۔ بادام کا خوب بڑا سا درخت ہے۔ جس کے پتوں کی منزل بہ منزل چھتیں ہیں۔ اس سے آگے کیلے اور آم کے گھنے پیڑ ہیں۔ کھڑکیوں کی گرل میں لپٹی ہوئی نوزائیدہ بچے کی طرح انگڑائیاں لیتی منی پلانٹ کی بیلیں ہیں۔ پہلی منزل کی مضبوط سیاہ گرل تھام کر بارہا فری پیریڈز میں اس گھر میں لے آتے جاتے افراد کو دیکھا ہے۔ ایک ہی گھر میں ایک ہی والدین کی اولادیں کیسی کیسی قسمیں لے کر آتی ہیں۔ مجھے بار بار زریں کا خیال آتا ہے۔ کیسا خوب صورت خول اس نے اپنی شخصیت پر چڑھائے دکھا ہے۔ کہتے ہیں ہر چمکنے والی چیز سونا نہیں ہوتی۔ یہیں سے مجھے اختلاف ہے۔ جتنی دیر چمکنے والی چیز کو سونا سمجھتے رہو بڑا کیا ہے۔ کسی شے کی کوئی حقیقت نہیں۔ سوائے اس کے کہ جو انسان نے اسے بخشی ہے۔ وہ ایک فنکارہ ہے۔ آخر اسے بھی مانوس چہروں اور چاہنے والے خوب صورت لوگوں کی تمنا تھی۔

میں اس دن وقت سے کچھ پہلے ہی کالج پہنچ گئی تھی اور بدستور گیٹ میں داخل ہونے والی لڑکیوں پر نظر تھی۔ شاہ جہاں گزشتہ دنوں ڈرائیونگ سیکھتی رہی تھی۔ وہ بڑے وقار سے اپنی اوپل کار کو تیراتی ہوئی لائی تھی۔ آم کے رس جیسی رنگت والی اوپل کار اور

زریں بھی رکشہ سے اتر کر سڑک پار کر رہی تھی۔ میری سمجھ میں نہ آتا یہ لڑکی رکشہ گیٹ تک کیوں نہیں لاتی آخر۔ اس لڑکی سے میں پوچھ کر رہوں گی۔

قریب آنے کے لئے کیسے حادثے پیدا ہو جاتے ہیں۔ اچھی بھلی گاڑی کا چلتے میں پہیہ پنکچر ہو گیا۔ اب کیا ہو۔ دور سے آتی رکشہ کو ہاتھ سے اشارہ کیا۔ ناقابل یقین بات یہ ہوئی کہ عین سامنے آکر رک گئی۔ جب کہ سواری بھی موجود تھی۔ یہ زریں تھی میں نے پہلی بار اسے غور سے دیکھا اس کی آنکھیں چھوٹی تھیں مگر گہرے پانی کی طرح جن میں طوفان اندر ہی اندر گزر جاتے ہیں اور سطح پرسکون رہتی ہے۔

"آپ شاید ہمارے کالج میں پڑھتی ہیں۔"

"ہاں جی۔ شاید آپ بھی ہمارے کالج میں؟"

ہم دونوں ہنس پڑے تھے۔ بس یہی ہماری پہلی ملاقات تھی پھر سیکشن بھی ایک ہی ملا۔ مضامین بھی ایک اور مذاق بھی ایک۔ کالج کی اس دنیا میں کتنے ہی چھوٹے چھوٹے غم ہوتے ہیں جو اس عمر میں بہت بڑے اور اہم معلوم ہوتے ہیں جیسے ٹیوٹوریل کے لئے کتابوں کا جھگڑا، ٹیسٹ کی تیاری، لیکچرار پر اچھے امپریشن مرتب کرنے کے جتن۔ مختلف مقابلوں میں جیتنے کی دیرینہ خواہش۔ فلاور ڈیکوریشن کا اہتمام کیا جا رہا تھا۔ انٹر کالجیٹ مقابلہ تھا۔ کالج میں جگہ جگہ پوسٹر لگا دیئے گئے تھے۔ لڑکیاں گارڈننگ پر لائبریری سے محدود کتابوں کو حاصل کرنے کے لئے مری جا رہی تھیں اور مجھے تو لائبریرین سے کشیدہ تعلقات کا غم کھائے جا رہا تھا۔ وہ مجھے دیکھتی اور منہ پھیر کر کہتی تھی "خاموش پلیز" یا پھر چلی جائیے۔ زریں عجیب پر اسرار لڑکی تھی۔ ہر بات میں اپنی انفرادیت برقرار رکھنے والی۔ مجھے تڑپتے دیکھ کر کہتی۔

"اس سے زیادہ پر لطف کام تو پھٹے کپڑے رفو کرنا اور دال کو بگھار دینا ہے۔ کامریڈ فلاور ڈیکوریشن کے لئے تمہیں کتابوں کی کیا ضرورت ہے۔ کیا کبھی تم نے ترکاریاں نہیں ابالیں یا اناج نہیں دیکھا۔ بڑے سے کدو کو بینٹ کر کے کارنیشن سجا دو یا پھر سرخ مرچوں میں مکئے چھو کر ترتی

میں جھونک دو۔ سجاوٹ کے لئے ذراسی کامن سینس کی ضرورت ہوتی ہے۔ پرانی چنگیریں رکابیاں اور اماں کے جہیز کے بڑے بڑے تھال، نمدے کی جائے نماز تو میں نے بھی دیواروں پہ سجا رکھے ہیں۔ بس آرائش خانہ پہ رسالہ نکالنے کی دیر ہے۔"

"زریں تم دل دکھانے والی باتیں کیوں کرتی ہو جب کہ تمہیں معلوم ہے یہ میری ہابی ہے۔ دل دکھانا بری بات ہے۔" اپنے شوق کا یوں خون ہوتے میں نہ دیکھ سکتی تھی۔

"میرے خیال میں تو کوئی زیادہ بری بات بھی نہیں۔ میں تمہیں بڑا آدمی دیکھنا چاہتی ہوں دکھے دل ہی نام پیدا کرتے ہیں۔ تخلیقی قوتیں انہی میں بیدار ہوتی ہیں۔ میر۔ فانی۔ کیٹس۔ لوتھر کنگ دکھی انسان تھے۔ ہر مفکر دکھی ہوتا ہے۔"

"اچھا زریں خدا کے لئے واپس آجاؤ۔ اپنے نام سے ایک کتاب ہی ایشو کروا دو۔ ماڈرن گارڈننگ۔"

کام رٹیڈ پڑھائی میں دل لگاؤ۔ سجاوٹ بعد میں بھی سیکھ سکتی ہو۔ لڑکی ذات ہو عمر بھر سجنا پڑے گا۔"

"تم کو گھمنڈ ہے نا اپنی قابلیت پہ۔ بس رہنے دو۔ میں خود ہی کر لوں گی۔"

"اچھا سنو۔ یوں کرلو۔ "اکی بانا" طرز پہ سجالو۔ جھربیرا کے دو تازہ پھول تھوڑی فرن۔"

"کیا کھانے کی ترکیب بتا رہی ہو؟"

"ہاں۔ بکومت۔ سجاوٹ کی رساپی ہے۔ مٹی کا سرخ پیالہ میرے پاس رکھا ہے۔ اس میں رس گلے آئے تھے۔ اور پام کے تین پتوں کو تلاش کر پن ہولڈر میں اس طرح جماؤ کہ ایک سب سے بڑا آسمان کے لئے۔ اس سے چھوٹا انسان کے لئے اور سب سے چھوٹا زمین کے لئے۔"

"میں سوچ رہی ہوں تم بتانے میں اتنی محنت کر رہی ہو۔ خود کیوں نہیں بنا کر

مقابلہ میں رکھ دیتیں۔''

"اونہہ ذرا ذراسی معلومات پر انعام کا لیبل لگوانا۔ مجھے چھچھوراپن لگتا ہے۔"

"مجھے تو تمہاری بے ہودہ انکساری بھی چھچھوری لگتی ہے۔'' پراؤڈ سوان۔

''تم درست سمجھیں۔ یہ Modesty . سے کم نقصان دہ۔ ہا ہا۔

زریں کسی طرح بھی شکست قبول نہیں کر سکتی تھی۔ مارے غصے کے میرا خون کھولنے لگتا مگر وہ مسکراتی رہتی۔ یہ کتنے غم کی بات تھی معمولی سی لڑکی۔ سادہ لباس۔ کس کر باندھی ہوئی چٹیا اور رکینوس شوز پہنے انتہائی معمولی شکل کی لڑکی۔ لیکن ذہنی پختگی نے اسے ہم عمر لڑکیوں سے جدا کر رکھا تھا۔ اس کی یہی باتیں میرا پیچھا نہ چھوڑتیں۔ اسے مس شاہ ہر دلعزیز ہونے کے باوجود ناپسند تھیں۔ اس کے خیال میں انہوں نے لڑکیوں کو اپنی چاہت میں گرفتار کر کے آزادانہ مطالعہ پر پہرے بٹھا دیئے تھے۔ لڑکیاں انہی کا پڑھایا پڑھتی تھیں اور انہی کا لکھایا لکھتی تھیں اور انہی کی سوچ سوچتی تھیں۔

"میں آزاد مزاج لڑکی ہوں۔ اپنی خلوتوں میں اتنی زیادہ دخل اندازی برداشت نہیں کر سکتی۔''

''یور ہائینز ایکسیلینسی۔ آپ کو تو برطانیہ کی پارلیمنٹ کی آزاد ممبر ہونا چاہیئے تھا۔''

"میرا مذاق نہ اڑاؤ۔'' وہ بغیر آواز نکالے بے طرح ہنسنی جس میں ایسا تمسخر ہوتا کہ میرے آنسو نکل پڑتے۔ اسے اور ہنسی آتی۔ تم وارداتِ عشق میں نووارد ہو کامریڈ۔"

"اچھا بتاؤ اقبال پر ٹیوٹوریل لکھ لیا ہے تم نے۔'' میں نے بات ٹالنے کے لئے لان میں لگی گھاس کو اضطراب میں توڑنے لگی۔

''نہیں۔'' وہ لاپرواہی سے بولی۔

میں نے سوچا وہ کتابوں کے چکر میں ہو گی۔ کیٹالوگ سے کتابیں چھاننے کے انتظار

ہیں ہے شاید۔"
"تو کب لکھو گی؟"
"یہی میں سوچ رہی ہوں۔"
"مجھے اقبال کی باتیں سمجھ میں نہیں آتیں۔ آنے لگتی ہیں تو زبان نہیں ہلتی۔ سوچتی ہوں وہی ٹکڑے ٹکڑے کتابوں سے نقل کر کے جمع کر لوں تو کیا فائدہ۔ مجھے ذاتی خوشی نہیں ملتی اس طرح۔ اور وقت کم ہے۔"
"تو پھر کیا نہیں لکھو گی۔"
"لکھوں گی۔ پیوند لگا کر۔" وہ ہنسی "تمہیں یاد ہے میں نے گزشتہ سال کالج کے میگزین میں۔ جدید ادب کے رجحانات پر مضمون لکھا تھا جیسے مس ترنم نے بے دلی سے میگزین میں شامل کیا تھا اسے پڑھنے کے بعد ایک ایڈیٹر کے کئی خط میرے نام آئے جن میں نہ صرف مضمون کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے بلکہ ادارت میں شامل کرنے کا اصرار بھی کیا ہے۔"
"کیا سچ۔" مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔
"تو کیا جھوٹ؟"
"یہ تم خوشخبری سنا کر رہی ہو۔ اتنا برا منہ بنا کر۔ بس اپنی خوب صورت مشرقی قدر موڈیسٹی ہی کو سینے سے لگائے رکھنا۔"
"ننھی چوزہ کا مر بڈ۔ تم ابھی انڈے کے اندر رہی ہو۔ خول توڑ کر نکل بھی آؤ ننھے چوزے۔" اس نے نرمی سے میرا سر دبایا۔ وہ مضمون بھی میں نے کتابوں سے ٹکڑے جمع کر کے پیوند لگا کر شائع کرایا تھا۔ کہیں کہیں میرا جملہ آ جاتا تھا جو وزنی جملوں کے درمیان رسی کے پلوں کا سا کام کرتے ہیں۔"
"تم یہ فراڈ بتا بھی رہی ہو پھر۔"

"تو کیا کروں۔ غلط حرکتوں کو چھپا کر اپنا ذہن دلدل نہیں بنانا چاہتی۔ کامریڈ مجھے ذہنی صحت کی ضرورت ہے۔"

"مجھے تو وہ ضرورت سے زیادہ بحال نظر آتی ہے۔ سنو ایک بات بتاؤ گی؟ یہ رکشہ کا کیا چکر ہے۔ اتنا دور کھڑا کرتی ہو۔"

مجھے معلوم تھا کہ اس بات پر اس کا دل دکھتا ہے۔ وہ بھی تو کس قدر میرا دل دکھاتی تھی۔ وہ سن کر پھیکی ہنسی ہنسی۔

"کامریڈ تم نے غلط پہچانا۔ یہ میری دکھتی رگ نہیں ہے۔ محض اتفاق ہے۔ رکشہ کے دور یا نزدیک کھڑا ہونے سے میری صورت و سیرت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

"صورت میں تو نہیں پڑتا ہے۔ سیرت پر پڑ سکتا ہے۔" میں نے اس کی چھوٹی آنکھوں میں جھانکا۔

اب کلاس میں بھاگنا چاہیئے۔ اللہ بخش ہتھوڑا لئے جا رہا ہے گھنٹی بجانے کے لئے۔"

اور وہ یوں بھاگی جیسے چلتی بس میں سوار ہونا چاہتی ہوں۔ زریں بیگم یہی تمہاری کمزوری کا پہلا درجہ تھا جس نے میرا اشتیاق بڑھایا۔

میں آم کے پیڑ کے پاس سیڑھیوں پر بیٹھی کچی امبیاں دیکھ رہی تھی کہ وہ آہستگی سے میرے پیچھے آ کے بیٹھ گئی۔ نہ جانے کب تک میرا تماشا دیکھتی رہی۔ اس کی سانس اور پچکی ہوئی ہنسی سے میں جان گئی۔

"یہ کینوس شوز تم اسی لئے پہنتی ہو۔ بلی کی طرح آ کے بیٹھ گئیں۔ بڑی بد اخلاقی ہے کسی کو یوں چوری چھپے پڑھنا۔"

"ایسی بھی کوئی پڑھنے کی چیز نہیں ہیں آپ۔ نہ ہی سیڑھیاں کوئی خلوت گاہ ہیں ویسے سیڑھیوں پر طلبہ کا بیٹھنا مجھے یونیورسل 'ٹرتھ' لگتا ہے۔" وہ مجھے امبیوں پر کچا کچ دانت چلاتے دیکھتی رہی۔ سنو ایک پن دینا پائنچہ ادھڑ گیا ہے۔"

اور دوسرے پائینچے کا کیا ہوگا۔" میں نے دوسرے پائینچے کی طرف اشارہ کیا جو زیادہ ادھڑا ہوا تھا۔ وہ ہنسی۔

"اور اگر کالر بھی آپ درست کر سکیں تو۔" وہ اور ہنسی۔

"مجھے حیرت تھی۔ لباس کے معاملے میں وہ بے تکان بول سکتی تھی اور بے تکا بھی شاید۔ مس لبنیٰ ساڑھی کے ساتھ بلاؤز نہیں پہنتی ہیں اور بیٹی کوٹ نہیں بلکہ اسکرٹ پہنتی ہیں۔ جبھی تو ساری پنڈلیاں دعوت نظارہ دیتی ہیں۔ مس نازلی کے بلاؤز کے اندر قمیض پہنتی ہیں اور مس سائرہ تو سرے سے بلاؤز ہی نہیں پہنتی۔ کون ان تکلفات میں پڑے۔"

وقت آنے پر میں بھی دیکھوں گی تم کیسے ڈریس اپ ہوتی ہو۔ لوگ کہیں گے بیگم زریں پیپے والا کا شمار انتہائی خوش پوش خواتین میں ہوتا ہے۔"

لیکن تم غلط جا رہی ہو۔ تنقیدی نظر رکھنا اور بات ہے۔ ورنہ خوش پوشی ہمارے ہاں مثبت علامت نہیں۔ خوش پوش خواتین کا سلسلہ اس معاشرے میں بدکردار عورتوں سے ملا دیا جاتا ہے۔"

معاشرے میں اچھائی برائی کو پرکھنے کا معیار کیا ہے؟"

"تم نے وعدہ کیا تھا کہ بات نہیں کاٹو گی۔" زریں جھنجلا کر بولی۔ "اب تمہاری سزا یہ ہے کہ تم مجھے لطیفہ سناؤ۔ ویسے میرا دل بھی بے حد اداس ہے۔ اس نے اپنا ہاتھ میرے شانے پر رکھ دیا۔

"عورتوں کا اداس ہونا ہماری روایت ہے۔ وہ زیادہ حسین نظر آتی ہیں۔" میں نے اس کا ہاتھ ہٹا کر واپس اس کی گود میں ڈال دیا۔

"بکومت۔ میں عورت نہیں ہوں۔"

"دیکھو۔ اس پیڑ پر کچھ عرصہ پہلے امبیوں کے گچھے تھے۔ سب نے لوٹ لئے۔ میرے

حصے میں ایک اکلوتی امبی آئی ہے جس کے تین حصے گٹھلی پر مشتمل ہیں۔ اس لئے میں زیادہ اداس ہوں تم کوئی لطیفہ سناؤ۔"

"کس کوالٹی کا لطیفہ چاہیئے۔ گھریلو۔ ذاتی رلچر، ادبی، سیاسی، تعلیمی وہ انگلیوں پر گننے لگی۔

"کوئی بھی ایسا لطیفہ جس سے مجھے ہنسی آسکے۔"

"ایک دفعہ شا کا مرٹیڈ (برنارڈ شا) کو ایک حسینہ نے خط لکھا۔ اگر تم مجھ سے شادی کر لو تو۔"

"اتنا پرانا۔ میرا سنا ہوا ہے۔"

"اچھا تو ایک بار جناب چرچل آنجہانی پاگل خانے کا معائنہ کرنے تشریف لے گئے۔ ایک پاگل سے بات چیت کرنے کا موقع ملا تو اس نے پوچھا۔ آپ کا کیسے آنا ہوا چرچل بولے۔ میں اس ملک کا وزیر اعظم ہوں اور۔۔۔ اتنا ہی سن کر پاگل ٹھٹھا لگا کر ہنسا اور چرچل کا کندھا تھپتھپایا اور بولا۔ یار فکر نہ کرو۔ یہاں آنے والا ہر کوئی یہی کہتا ہے۔ جب میں یہاں آیا تھا تو خود کو اس ملک کا بادشاہ کہتا تھا۔"

"اس لطیفہ سے مجھے زیادہ ہنسی نہیں آئی کوئی اور اچھا لطیفہ سناؤ۔

"تو سنو۔ ایک نرس کو اس کے فوجی محبوب نے محاذ سے انتہائی محبت بھرا خط لکھا۔" زریں میرا اشتیاق دیکھ کر ذرا رکی۔

"ہاں بولو پھر کیا ہوا۔"

"اس نے لکھا کہ تم ہر وقت بے حد یاد آتی ہو میدانوں میں، جنگلوں میں، گھاٹیوں پر پہاڑوں پر خندقوں میں۔"

"چھوڑیئے بیں! یہ تم چرچل کی تقریر کا اقتباس پڑھ رہی ہو یا محبوب کا خط۔" میں جل کر بولی۔

"اچھا سنو۔ ابھی ہنسی کا مقام آنے والا ہے۔ اور یہی اگر میں زخمی ہو گیا تو تم میری مرہم پٹی کرنا یہ میرے لئے کتنی خوشی کی بات ہو گی اگر تم اپنے اسپتال میں میری تیمارداری کرو۔ نرس نے جواب میں لکھا" میرے پاس تو تمہیں کوئی معجزہ ہی لا سکتا ہے۔ کیونکہ میری ڈیوٹی زچہ خانے میں ہوتی ہے۔"

میرے کھلکھلا کر ہنسنے پر وہ جھلا گئی۔

"مجھے معلوم ہے کہ تمہارا ذوق تباہ ہو رہا ہے۔ بالکل امریکن کا مکس مزاج ہو گیا ہے۔"

"الٹی آنتیں گلے پڑ گئیں۔ لطیفہ تو تمہارا ہی تھا۔"

"اس سے کیا ہوتا ہے۔ مجھے تو وہ لطیفے بھی آتے ہیں جس سے تمہیں قے آجائے۔ جنہیں گھٹے ماحول کی لڑکیاں چپکے چپکے سنا کر دوپٹہ منہ میں ٹھونس کر ہنستی ہیں۔ ان میں بند گٹر کی سی سڑی بو ہوتی ہے لیکن انہیں ہنسی آتی ہے۔ ہمیں نہیں آتی تو کیا ہوا زرین۔" اپنی کس کر بندھی ہوئی چٹیا کو گول گھما کر بولی۔ "لطیفے نسخے کے طور پر بھی استعمال کئے جا سکتے ہیں جیسے لطیفہ پنیچی۔ مثلاً سر درد پیدا کرنا اور قے دلانا وغیرہ۔ دیکھو HIPPOCRATES نے موسیقی نہانا اور اچھی غذا کو بہت سی ذہنی بیماریوں کا علاج بنایا تھا اس طرح لطیفوں سے بھی۔"

تمہیں اتنی بہت سی باتوں کا پتہ کیسے چلتا ہے۔ میں نے جھک کر اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ کہ گیٹ کے سامنے ہی ایک رکشہ آکر رکا۔ زرین آواز سنتے ہی اٹھ کھڑی ہوئی اور باہر دوڑ گئی۔

کتنی عجیب لڑکی ہے مجھے اس سے بے طرح حسد ہونے لگا تھا۔

ابھی ابھی کیسی دلدوز آواز میں کوئل کوک رہی تھی۔ میں کھنچی ہوئی آم کے پیڑ کے قریب پہنچی۔ چند ایک امبیاں بڑی اونچی سی ڈال پر جھول رہی تھیں میں کچھ دیر کھڑی دیکھتی رہی پھر انہی سیڑھیوں پر بیٹھ گئی۔ اسی اثنا میں زرین گیٹ سے سامنے رکشہ سے اتری لیکن سڑک کے اس پار۔ صاف کپڑوں میں ملبوس رکشہ والا نوجوان سا معلوم ہوتا تھا۔

کبھی کبھی زریں مجھے بچپن میں پڑھی جانے والی پراسرار کہانیوں کا کردار معلوم ہوتی۔ دونوں جانب نظریں دوڑاتی ہوئی زریں اندر داخل ہوئی۔ مجھے دیکھ کر آہستہ آہستہ قریب چلی آئی۔

"معلوم ہوتا ہے۔ بیروزگار ایم اے پاس رکشہ والا کہیں ہاتھ لگ گیا ہے" میں نے کہا۔

"یہ تم نے ہوسٹل کی میٹرن کے فرائض کیوں سنبھال لیے ہیں،" وہ مجھے سامنے بیٹھا دیکھ کر بولی۔

"جب سے تعلیمیافتہ طبقہ رکشہ چلانے لگا ہے۔ اور۔"

"مجھے تمہاری بے ہودہ باتیں پسند نہیں ہیں،" وہ یہ کہہ کر قدم جماتی کلاس روم چل دی۔ وہی گھر کی سلی ہوئی براؤن یونیفارم، کینوس شوز اور کس کر بندھی ہوئی چٹیا۔ آزاد من موجی لڑکی۔

واپسی پر سیڑھیوں پر سے اترتے ہوئے میں نے اس سے کہا۔

"زریں مجھے بال سیٹ کروانے جانا ہے۔ تم بھی چلو ساتھ۔"

"میری مانو تو طالب علمی کی زندگی سادگی میں ہی گزارو۔ سنورنے کے لئے ساری زندگی پڑی ہے۔"

"مجھے تم سے اسی جواب کی توقع تھی۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اتنی ترقی کے باوجود عورتیں اتنے قدیم ترین مشاغل اپنائے ہوئے ہیں۔ عورت ازل سے سجاوٹ میں لگی ہوئی ہے۔ مرد پھر بھی جسمانی قوت سے ذہنی قوت پر آ گئے ہیں۔ کیا اس دنیا کی سجاوٹ میں ہمارا کوئی حصہ نہ ہونا چاہیئے

میں نے دیکھا وہ اپنی انتہائی معمولی شکل رکھنے کے باوجود بے حد معمولی معصوم نظر آ رہی تھی۔ شاید اسے اپنی شکل کا احساس ہے اس لئے بھی عورتوں کی اس قسم کی مصروفیت

سے وہ چڑ جاتی ہے۔ وہ کتنی سنجیدہ ہو گئی تھی۔ "اب تو کم از کم اس دور میں تو شکل ظاہر دولت محض اضافی اشیاء ہونا چاہیئے۔ ورنہ انسان کو انسانیت کے مستقبل سے بالکل مایوس ہو جانا چاہیئے۔ کیا تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہی رہے گی۔ ہم سب ایک بہت بڑے ہنڈولے میں بیٹھے بس گول گول گھومے جا رہے تھے۔"

"زریں کامریڈ۔ تم بے حد اداس ہو۔ آج کے مباحثے میں نام دے دوں! گھمسان کا رن ہو جائے گا۔"

"مباحثے! محض مہذب انسان کو ناشائستگی سکھانے کا فن ہے کیونکہ مہذب انسان بٹیر۔ مرغے اور دنبے نہیں لڑا سکتا اب۔"

"اچھا سنو۔ ایک بات بتاؤ گی؟"

زریں دیکھے بغیر کروٹن کے پتے مسلتے ہوئے بولی۔ "عقل سے پیدل آدمی کیا پوچھو گی مجھے معلوم ہے۔" اس نے جھنجلا کر مسلا ہوا پتہ دور پھینک دیا۔

"دیکھو تمہارا انداز پرائمری اسکول کی چڑچڑی استانی کا سا ہو رہا ہے۔ تمہیں بتانا ہو گا کہ یہ رکشہ کا کیا چکر ہے۔" وہی رکشہ سامنے درخت کے پاس کھڑا تھا۔ جوں ہی اس کی نظر پڑی ذرا سی اچھلی اور سیدھی گیٹ کی طرف چل دی۔

دو دن وہ غیر حاضر رہی۔ میں برآمدے میں گرل تھامے اس کی منتظر تھی کہ اچانک وہی رکشہ ایک جانب رکا۔ وہ کود کر باہر نکلی۔ رکشہ والا بدستور صاف ستھرے کپڑوں میں ملبوس تھا اور خوش شکل بھی۔ زریں نے جھک کر اس سے کچھ کہا اور مسکراتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔

میں نادم اور پریشان ہو کر پیچھے ہٹ گئی۔ دوسروں کو جاننے کا غم بھی کتنا رسوا کن ہوتا ہے۔ میں نے پختہ ارادہ کر لیا کہ اب رکشہ سے متعلق اس سے کوئی بات نہ کروں گی۔

ایک دن عجیب ہی اتفاق ہوا۔ سڑک پر گاڑیوں کا بے تحاشا رش تھا۔ میں کالج

سے کچھ فاصلے پر ہی اتر کر پیدل چل پڑی کہ زرین کا رکشا اسی درخت کے قریب رکا۔۔
رکشہ والے نے چند سکے اس کے ہاتھ میں رکھ دیئے۔ وہ اسی لمحے تیزی سے بولی۔ "ابا دو
آئے اور دے۔" "آج تو بہت سی سواریاں اٹھاؤ گے۔" اور اس نے مسکراتے ہوئے چند
سکے اور اس کی ہتھیلی میں رکھ دیئے۔ ہم کیسے خوابوں کے راہی تھے! اور خوابوں کے اس
انجانے سفر میں یہ کیسا موڑ تھا۔ انجانا، ناقابل یقین سا۔ مجھے وہ کھلونا یاد آ گیا جس کو
گھمانے سے ہر بار نہایت رنگین خوب صورت نمونہ بنتا ہے۔ ایک بار جو کھول کر دیکھا
تو کانچ کے ٹکڑے اور ٹوٹی چوڑیاں ہاتھ میں آ گئی تھیں۔

ستمبر ۱۹۷۱ء

گدڑی

"آپا جی اللہ کرے میں مرجاؤں۔ جو بھنگیوں والا کام کروں"۔ گڈی اپنی چپیاں سی آنکھیں کھول کر مجھے یقین دلا رہی تھی "قسم رب دی میرا مردہ خراب ہو گیا ہے۔ ذرا اور بڑی ہو جاؤں۔ بس!" وہ جھاڑو پٹخ کر بولی۔ گڈی کی عمر یہی کوئی آٹھ نو سال ہو گی۔ وہ ہماری جمعدارنی جنداں کی لڑکی تھی۔ اسی دوران دھڑ سے دروازہ کھلا اور جنداں دروازہ کھلنے کے ساتھ وہیں ڈھیر ہو گئی۔

"ہائے تھک کر چور ہو گئی ہوں" اس نے منہ پھاڑ کر جماہی لی۔ "ہاؤ ہاؤ" ہاتھ منہ پہ بجاتی ہوئی سر کھجانے لگی۔ وہ کچھ زیادہ ہی بھنگن واقع ہوئی تھی۔ موٹا ہونا تو خیر اتنی غیر معمولی بات نہیں۔ ایک سے ایک موٹے آدمی اور نحیف و نزار دنیا میں پائے جاتے ہیں لیکن جنداں کے انداز انتہائی موٹی عورتوں والے تھے۔ اس کی ہر حرکت سے یوں لگتا جیسے ڈھائی من کی بوری اٹھا رکھی ہو۔

"آپا جی کوئی چار دا ہے۔" وہ مٹی کا پیالہ آگے بڑھا کر بولی اور ایک طرف بیٹھ گئی۔

خان چائے لایا اور انتہائی پرے ہٹا کر دو گز چائے انڈیل دی جس میں سے کچھ تو جنداں کی وسیع و عریض ران پر گری۔ کچھ فرش پر۔ "دیکھ تو سہی وے۔ ساری چائے ڈول رہا ہے۔ آسمان سے ٹپکا رہا ہے تو۔" گڈی اچھل کر بولی۔ "چل اٹھا اپنا برتن۔ کوئی دوسرا برتن لاؤ سالن کے واسطے۔" خان نے حقارت سے کہا اور اندر سے دو تین طرح کے سالنوں کو جمع کر کے لایا۔

"گڈی جا دوسرا بھانڈا لیا۔" جنداں دونوں ہاتھوں سے سر کھجاتے ہوئے بولی۔

گڈی ٹین کا ایک غلیظ ڈبہ اٹھا لائی اور ماں کے آگے پٹخ دیا۔

اوئے گڈا اوپر کرو سالن ڈالوں۔" خان کھڑے کھڑے بولا۔

"ہائے ایک ہی جگہ جما کھڑا ہے۔ پیروں میں سریش لگی ہوئی ہے۔"

"بکواس بند کرو۔ گڈا۔" وہ وہیں سے بولا۔

"بکواس بند کرو۔" وہ نقل اتارتی ٹین کا ڈبہ اس کے قریب لے گئی۔ خان نے ریفریجریٹر سے نکالے ہوئے سالن کے مختلف نمونے باری باری غلیظ ڈبے میں ڈال دیئے۔

"بڑا رعب جما رہا ہے۔ تو کوئی وڈی ماں دا پتر ہیں۔" گڈی پھیلے ہوئے سنہری بالوں کو کانوں میں لپیٹتی ہوئی بولی۔ خان جان بوجھ کر ستاتا تھا۔ اور وہ ہمیشہ اسے جل کر جواب دیتی تھی۔ غصے میں اس کے موٹے گلابی ہونٹ بے طرح پھڑکتے۔ ناک کو خاص انداز میں خم دے کر بولتی تو خان کو بھی چھیڑنے میں بے حد مزہ آتا۔

"اور کیا؟ تم تو بھنگن ہو۔ میں خان ہوں سیدے۔"

"تیرے جیسے بہت دیکھے ہیں خان بیدے۔ رنگ تو دیکھ گاب (کیچڑ) ورگا۔"

وہ سر جھٹک کر کہتی تو رخساروں پر سرخی لہریں مارنے لگتی۔

جنداں اس دوران سوکھے ٹکڑوں کو ٹھنڈی چائے میں بھگو کر کھانے میں جٹ گئی تھی۔ غلیظ ڈبے میں پڑا ہوا سالن کیچڑ لگ رہا تھا۔ میں نے دزدیدہ نگاہوں سے دیکھا اور مجھے

کتوں پر رشک آنے لگا۔ کم از کم کتے اگر یہ سب کچھ اس طرح کھاتے ہیں تو وہ کتے ہوتے ہیں۔ انسان تو نہیں ہوتے نا۔ خان طوطے کا پنجرہ بھی روزانہ صاف کرتا ہے۔ کٹوریاں دھو کر پانی ڈالتا ہے۔ بلی کو بھی بلوریں صاف پیالی میں دودھ ڈال کر دیتا ہے۔ مگر ہم کیا کریں۔ یہ مخلوق کہاں فٹ کی جا سکتی ہے پتہ نہیں۔ ایک تو بھنگن جن کے ہاتھوں کے ہر سیل میں موروثی پلیدگی رچی ہوئی ہے اور جس انداز میں وہ سابقہ دور میں صفائی کرتی رہی ہیں۔ اس لحاظ سے تو گویا ان کا خمیر بھی اسی گندگی سے اٹھا ہے پھر بھلا یہ انسانوں میں کیسے شامل کئے جا سکتے ہیں آخ۔

"آپا جی آج کون سی فلم لگی ہوئی ہے"، گڈی میرے ہاتھ میں اخبار دیکھ کر آگے بڑھ آئی۔ جواب کا انتظار کئے بغیر بولی۔ "آپا جی آپ نے "کنواریاں لاجاں" دیکھی ہے"

میں نے سہم کر اس چھوٹی سی لڑکی کو دیکھا۔

"نہیں گڈی"، میں چھوڑی ہوئی انتہائی بے ہودہ خبر کو دوبارہ ڈھونڈنے لگی۔

"فلم والا صفحہ نکالو نا جی ذرا۔ جنداں دیکھا ہے میں دو فلمیں اور دیکھوں گی"۔

وہ ماں سے پنجابی میں بولی۔ پھر انگلیوں پر دہرانے لگی۔ "شیر دا پتر"۔ نہیں "یاریاں"۔ "ماہی میرا چن ورگا"۔ آپا جی۔ آپ نہیں دیکھتیں فلم؟ اس کی چھوٹی چھوٹی نیلی آنکھیں مبہوت تھیں۔

"نہیں گڈی"، میں نے صاف جھوٹ بولا۔ فلمیں دیکھنا بری بات ہے"۔

"آپا جی سب یہی کہتے ہیں۔ پھر فلمیں بناتے کیوں ہیں؟"، وہ بگڑ کر بولی۔ کچھ دیر سوچتی رہی پھر بولی۔ آپا مجھے تو بڑا مزا آتا ہے۔ میں فلم نہ دیکھوں تو مر جاؤں۔" وہ مختلف اداکاراؤں کی شکل اور لباس کی تفصیل بتانے لگی۔

"چل نی گڈی۔ جلدی کر۔" جنداں آدھے سے زیادہ کھا چکی تھی۔ چائے کا آخری گھونٹ پی کر پیالی اٹھاتے ہوئے بولی۔

"ہائے ربا۔ جنداں ساری چائے پی لی تو نے"۔ گڈی بے دلی سے آگے بڑھی۔

"یہ سالن تو اٹھا نامرادے!" چنداں کو اٹھنے میں کئی مراحل طے کرنے پڑ رہے تھے۔

"میں نہیں اٹھاؤں گی۔ تجھے کھانا ہے تو ہی اٹھا" وہ منہ پھلائے باہر چلی گئی۔ میں ٹاٹنگ کر رہی تھی۔ دیوان پر تازہ اخبار رکھا تھا۔ اون کا گولہ کرسی کی ٹانگوں میں ناچ رہا تھا۔ گڈی جلدی جلدی غسل خانہ دھو کر خان کے پاس آکر کھڑی ہوئی۔

"خان چائے ہے آج"۔ اس نے چینی کا نیا پیالہ رکھا۔ جب وہ چائے ڈال چکا تو ایک طرف بیٹھ کر پینے لگی۔ ایسی ٹھنڈی پانی چائے۔ گرم تو کر دیتا تو تیرا کیا بگڑ جاتا سیدا"

"سیدا نہیں۔ سید بولو، سید۔"

"تو مجھے گڈا کیوں کہتا ہے۔ میرا نام گڈی ہے"۔

زیادہ نخرے نہیں کرو۔ بھنگن تو ہے۔ نیا پیالہ لایا ہے پستول تو نہیں لایا۔

"خان اسے چائے گرم کر کے دو اور سنو تم دونوں ایک دوسرے کا نام لیا کرو"، میں کرسی کی ٹانگوں میں الجھی ہوئی اون سلجھانے لگی۔

واپس اپنے کٹورے میں ڈال کر چائے گرم کروں"۔ اس نے انتہائی حیرت سے پوچھا۔

"ہاں۔"

"وہ اماں جی ——— پلید ہو جائے گا پھر"۔ وہ ہکلایا۔

"میں جو کہہ رہی ہوں گرم کر کے دو۔ پھر دھو لینا"۔

"گڈی جنداں نہیں آئی آج"۔

"ہاں جی۔ پھر کیا کروں۔ میری تو پسلیاں ٹوٹ گئی ہیں جنداں کا کام کر کے۔ میں مر جاؤں تو ان کو ذرا سمجھ آئے"۔

"تم مر جائے گا تو بھی جنداں تم کو قبر سے نکال لائے گا"۔ خان باسی روٹیاں

اور سالن لئے کھڑا تھا۔ "برتن لاؤ کھانا لے لو۔"

"بس۔ میں نہیں لوں گی کھانا۔ میرا پیٹ بھر گیا ہے۔" وہ بغیر دیکھے بولی۔

"تو اس کا ہم کیا کرے گا۔ گھر لے جاؤ۔" وہ خلاف توقع جواب سے گھبرا گیا۔

"آج تو کھا لے۔ روز نہیں کھلانا ہے خان بابا۔ وہ بابا پر زور دے کر شرارت سے ہنسی۔

"چلو بھئی کام کرو۔" وہ چڑ کر بولا۔

"اپنا منہ تو دیکھ چمگادڑ۔" اس نے جھاڑو کی نوک سے اس کی شکل کی طرف اشارہ کیا اور دوڑ کر باہر چلی گئی۔

میں صبح سویرے ہی برش منہ میں ایک طرف ٹھونسے گیندے کے پھول سجا رہی تھی۔ مڑے پتے اور لمبی ڈنڈیاں تراش کر الگ کرتی جا رہی تھی کہ گڈی ان کو مٹھی میں بھر کر چھاج میں ڈال رہی تھی۔ آج اتنی سویرے کیسے آ گئی ہو گڈی۔ آج بھی جنداں نہیں آئی؟"

"نہیں جی کہتی تھی مجھے بہت سستی آ رہی ہے تو ہی کام کر آ۔"

"تجھ سے سارا کام ٹھیک نہیں ہونا نا۔" وہ کچھ دل برداشتہ سی کھڑی رہی پھر بولی۔ "آپا جی کام تو سارا کر کے جاتی ہوں۔"

"تم اتنی چھوٹی ہو۔ کچرے کا ڈبہ بھی تم سے نہیں اٹھتا۔ دس پھیرے کرتی ہو راستہ بھر گند گرتا جاتا ہے۔"

"آپا جی تم ہی کہنا جنداں سے میری تو کوئی بات ہی نہیں سننا۔ مشٹنڈا شیما بھی ساتھ نہیں آتا۔ الٹا آنکھیں دکھاتا ہے۔" شیما اس کا بھائی تھا جو واقعی مشٹنڈا ہی تھا۔

"اے آج پھر تم اکیلا آیا۔" خان نکلتے ہی غرایا۔ اس نے آج تیل لگا کر خوب مانگ نکال رکھی تھی۔ دودھ سا سفید رنگ دمک رہا تھا۔ گڈی نے آج پہلی مرتبہ کوئی جواب نہ دیا۔ اسے دیکھا اور پھر بولی۔

"آپا جی میں تو بس مر ہی جاؤں گی۔ یہ گڈی پتنگ ایک دفعہ اوپر چڑھ گئی تو پھر

اترے گی نہیں۔ وہ اپنے گلابی ہونٹوں کو چبانے لگی۔

"ارے ہم تم کو اپنے لنگر سے اتارے گا۔ بڑا مضبوط ڈور ہے ہمارے پاس۔ وہ کچھ نہ بولی اور رسالہ کا لپٹا ہوا ورق اٹھا کر دیکھنے لگی۔ اس پر فلم کا کوئی اشتہار تھا اور ہیروئن کی بڑی سی تصویر تھی۔

"تم کھڑا تصویر دیکھتا ہے۔ کام نہیں کرے گا۔" خان بولا۔ گڈی نے پھر بھی کوئی جواب نہ دیا اور کاغذ پھینک کر غسل خانہ صاف کرنے لگی۔ چینی کی صاف پیالی میں گرم چائے پی اور جلدی جلدی باقی کام سمیٹ لیا۔

آج پھر گڈی اکیلی آئی تھی لیکن اس کے کپڑے صاف تھے اور بھورے خوب صورت بال گندھے ہوئے تھے جیسے ہی وہ اندر داخل ہوئی خان راستہ روک کر کھڑا ہو گیا اور انگلی سے غسل خانے کی طرف اشارہ کیا۔

"سیدھا غسل خانے میں چلا جاؤ۔ ہر وقت آپا جی کے پاس گھسا رہتا ہے۔" خان کے دانت ہنسنے میں موتیوں کی طرح جگمگا رہے تھے اور رخسار اور زیادہ سرخ لگ رہے تھے۔ گڈی بغیر جواب دیے چپ چاپ غسل خانے میں چلی گئی۔ جب صاف کر کے جانے لگی تو میرے پاس آ کھڑی ہوئی۔

"آپا جی میں نے پرسوں ہیرا نجھا دیکھی تھی اس وقت سے مجھے پتہ نہیں کیا ہو گیا ہے۔ بڑی اچھی فلم تھی۔

میں نے اسے چونک کر دیکھا۔ وہ اس وقت ڈھلی ڈھلائی موم کی گڑیا لگ رہی تھی۔ دونوں چوٹیوں میں سرخ دھجیوں کے پھول شانوں پر پڑے تھے۔ موٹے موٹے گال سرخ تھے۔ آنکھیں بھری ہوئی تھیں۔

"ارے گڈی یہ تو کہہ رہی ہے۔ زمین سے تو ابھی نکلی نہیں۔"

"آپا جی ہر وقت میرا دل بجھا رہتا ہے۔ ماں تو کوئی بات ہی نہیں سنتی۔ مجھے موت

ہی آجائے تو بہتر ہے۔ وہ یہ کہتی ہوئی باہر نکلی تو خان اس کے پیچھے لپکا۔

"ارے اوئے بھنگن روتا کیوں ہے۔ ہم تم کو اپنا دلہن بنائے گا۔ اس نے اس کی چٹیا کھینچی۔ گڈی جواب دیئے بغیر خاموشی سے خان کو کھڑی دیکھتی رہی۔ پھر چلی گئی۔

جنداں اکیلی لان کی راہداری میں جھاڑو لگاتی ہانپ رہی تھی۔ گڈی نے اس کے ساتھ آنا قریب قریب بند کر دیا تھا۔ جب وہ جانے لگی تو حسب معمول کھانے کے لئے پوچھا اور پھسکڑا مار کر ایک طرف بیٹھ گئی۔

"گڈی کو نہیں لاتی اب؟" میں نے پوچھا۔ خان بھی جواب سننے کے لئے کھڑا تھا۔

"آپا جی کیا بتاؤں۔ وہ بڑا سا نوالہ منہ میں ڈالتے ہوئے بولی۔ نو سال کی ہوئی نہیں اور لچھن خراب ہیں۔ فلموں کی شوقین ہے اس نے چائے کا گھونٹ بھرا۔ فلموں نے خراب کر کے رکھ دیا ہے۔ بتانے کی بات تو نہیں پر کس سے کہوں۔ آپا جی کہتی ہے مجھے محبت ہو گئی ہے۔ نہ کچھ کھاتی ہے نہ پیتی ہے۔ ایک کونے میں پڑی رہتی ہے۔ کتنی بار گر جانے کئی ہوں۔ باپ اور بھائی نے مار مار کر نیل ڈال دیئے ہیں پر۔ باز ہی نہیں آتی اپنی باتوں سے۔"

میرے اندر جیسے کوئی چیز ٹوٹ کر گرتی جا رہی تھی۔

"جنداں اسے میرے پاس تو لے آ ذرا۔"

"کہیں نہیں جاتی۔ آپ کا کہوں تو شاید آجائے۔"

گڈی سامنے کھڑی تھی۔ اس کے سرخ رخسار پچک گئے تھے۔ ہونٹوں کی سرخی غائب تھی۔ جسم ہڈیوں کا ڈھانچہ اور بدن پر نیل اور مار کے نشان پھٹے کپڑوں سے جھانک رہے تھے۔ تو بہ گڈی آسمان پر تن کر ساکن ہونے سے پہلے بجلی کے تاروں میں جا الجھی تھی جہاں بانس کے صلیب نما تنکوں میں بے رنگ کاغذ کی دھجیاں لہرا رہی تھیں۔

"گڈی کیا ہو گیا ہے تجھے؟" وہ خاموش رہی۔

"بولو گڈی۔ بات کیا ہے؟ تم نے بتایا تھا کہ تمہیں محبت ہو گئی ہے۔ بتایا تھا نا۔
میں نے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرا۔

"ہاں" وہ نقاہت سے بولی۔

"پھر تمہاری شادی کر دیں؟" وہ خاموش پلکیں جھپکاتی رہی۔

"تم ابھی بہت چھوٹی ہو۔ ذرا سی بڑی ہو جاؤ تو تمہاری شادی کر دیں گے۔
خان سے کر دیں؟"

اس نے حیرت سے مجھے اور پھر خان کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ذرا سی چمک پیدا
ہوئی۔

"خان کہتا ہے وہ پید پٹھان ہے۔ میں تو بھنگن ہوں۔" اس کی آواز جوں کی
توں جاندار تھی۔

"تو اور کیا۔ الو کا پٹھا فلم کا بات کرتا ہے۔ میں تو ابھی بارہ سال کا بھی نہیں
ہوا اور تم سے شادی بنائے گا۔ لخ لعنت۔"

"آپا جی۔ میں اب مر جاؤں گی۔ ہر وقت میرا جی یہی کہتا ہے۔"

"ایسی باتیں نہیں کرتے گڈی۔ تم اچھی ہو جاؤ تو جنداں سے کہہ کر جلد ہی تمہاری
شادی کرا دوں گی۔"

"بس کر گڈی۔ چل اب گھر۔" جنداں انتہائی بے پروائی سے اس کو کھینچتے ہوئے
چل دی۔

دوسرے روز جنداں غائب تھی۔ تیسرے دن وہ آکر حسب معمول کام میں لگ
گئی۔

میں نے پوچھ لیا۔ "کل تم نہیں آئی تھیں جنداں۔ کسی دوسرے کو ہی بھیج
دیا کرو۔"

"ہاں آپا جی کس کو بھیجتی ؟ گڈی مر گئی کل۔ رات فنائل کی گولیاں پیس کر کھا گئی تھی۔"

وہ تھوڑی دیر خاموش کھڑی رہی پھر بولی۔

"آپا جی نیا جھاڑو دے دو۔ پرانا میں نے پرسوں ہی پھینک دیا تھا۔"

افکار۔ ۱۹۷۱ء

مس نعمانہ ایم، اے

یہ مسئلہ کسی سلطنت کی جانشینی کا نہ تھا لیکن مینجر صاحب کے لئے اسکول چھوٹی سی سلطنت ہی تھی۔ اور وہ اس کے چہیتے حکمران جسے ان کے باپ دادا کامیابی سے چلاتے آرہے تھے اور آج کئی ایک اسی اسکول کے تعلیم یافتہ اعلیٰ عہدوں پہ فائز تھے۔ ان تعلیمی خدمات کی بنا پر مینجر صاحب کا خاندان احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ وہ اس ہفتہ کئی ایک میٹنگز بلا چکے تھے۔ لیکن نئے مینجر صاحب کا انتخاب ہی نہ ہو پاتا تھا۔ خود اب بوڑھے ہو چلے تھے۔ اولاد نرینہ تھی نہیں۔ واحد اولاد مس نعمانہ تھی جسے اعلیٰ تعلیم دلائی تھی اور انہی دنوں اس کا تقرر مقامی کالج میں ہو گیا تھا۔

مس نعمانہ جب سے لیکچرار کی حیثیت سے کالج جانے لگی تھیں مینجر صاحب دوپہر کا کھانا کھا کر لان میں آجاتے۔ حمید خان فولڈنگ چیئر کروٹن کے چتکبرے پودوں کے قریب کھول کر ڈال دیتا اور وہ نیم دراز ہو جاتے۔ دائیں طرف بید کی نازک تپائی پر سیدپ کار، اکھ دان اور اسکول کے کاغذات رکھے رہتے۔ ان کے قریب ہی تمبا کو کی منقش

ڈبیہ جو انہیں اسکول کے فرماں بردار استاد نے بیروت سے تربیت مکمل کر کے آنے کے بعد دی تھی۔ رکھی تھی۔ وہ منہ میں پائپ دبائے نیم وا آنکھوں سے گیٹ کی طرف دیکھتے ہوئے نعمانہ کے منتظر رہتے۔ جب تک وہ نہ آتی، اسکول سے متعلق جملہ شکایات اور کیفیات چکر لگاتی رہتیں۔ جہاں سوائے چند کے نت نئے استاد آتے اور چلے جاتے تھے۔ لڑکے بے حد شریر اور بدتمیز تھے۔ ہیڈ ماسٹر اگرچہ بزرگ، عمر رسیدہ اور تجربہ کار آدمی تھا مگر نظم و ضبط اس کے بس میں نہ رہا۔ پھر اب اسکول میں نت نئے تعلیمی اسالیب رائج ہو رہے تھے۔ کئی ایک نفسیاتی طریقے۔ مونٹیسوری میتھڈ اور کنڈر گارٹن میتھڈ اور نہ جانے کیا کیا۔ لڑکے مار پٹائی کے ڈر سے خوب کام کرتے تھے۔ استادوں کا رعب الگ تھا۔ پڑھائی میں محنت کرتے تھے۔ استادوں کے گھر کے کام بھی کرتے تھے۔ خود مینجر صاحب کو اپنے استاد کے لئے پانی بھرنا پڑتا۔ وہ تو ماسٹر صاحب نئے تھے۔ جب ان کو پتہ چلا کہ وہ اس اسکول کے مینجر صاحب کے صاحبزادے ہیں تو معافی مانگنا پڑی۔ یہ بات ان کی سمجھ میں بالکل نہ آتی تھی کہ نہ سزا نہ مار پٹائی۔ استاد شاگردوں سے ہنس ہنس کے باتیں کرتے ہیں۔ بلا ضرورت بار بار سمجھانے کے لئے اچھی باتوں کا لیکچر دے کر سر کھپاتے ہیں مگر پھر بھی نئی نسل انتہائی بدتمیز، نالائق اور بے تکی ہے۔

ایسے ہی بے شمار خیالات کے ہجوم میں ہارن کی آواز سنائی دے جاتی اور مس نعمانہ اپنی پیلے رنگ کی اوپل کار ڈرائیو کرتی ہوئی گیٹ میں داخل ہو جاتی۔ وہ اُتر کر بڑی سعادت مندی سے تسلیم کہتی تو وہ اس کی پیشانی چوم لیتے۔ یہی لمحہ ان کی زندگی کا حاصل ہوا کرتا تھا۔ وہ مس نعمانہ کو اسی روپ میں دیکھنا چاہتے تھے لیکن اس کے لئے انہیں کتنا بہروپ بھرنا پڑا تھا۔ یہ چند لوگ ہی جانتے تھے۔ ان دنوں چند دوسری پریشانیوں کے علاوہ خرابیٔ صحت زیادہ قابل تشویش تھی۔ اسی لئے اسکول چلانے

کے لئے وہ جلد ہی کسی کا انتخاب کرنا چاہتے تھے۔ رشتہ داروں میں سے بھی چند ایک نے اپنے آپ کو پیش کیا تھا۔

ان کے باپ دادا اس اسکول کے مینجر تھے۔ خود انہوں نے بھی اسی اسکول سے مڈل پاس کر کے یہ عہدہ سنبھالا تھا اور کامیابی سے مالی امداد مہیا کرتے چلے آرہے تھے۔ اسے ترقی دے کر مڈل سے میٹرک تک کر دایا تھا جہاں وہ اسکول سے متعلق پریشانیاں سہتے تھے وہیں ان کے کئی ایک مسئلے بھی اسکول کے مینجر ہونے کے ناطے حل ہوئے تھے۔ ذاتی زندگی میں انہیں اسی کے بل بوتے پر کافی کامیابیاں حاصل ہوئی تھیں۔ شعبہ تعلیم سے متعلق لوگوں سے ملنا جلنا تھا۔ اسی لئے اکثر و بیشتر تصاویر اخبارات و رسائل میں شائع ہو جاتی تھیں۔ سب سے بڑھ کر مس نعمانہ کی اعلیٰ تعلیم تھی جو محض اسی بنا پر ممکن ہو سکی تھی۔

مس نعمانہ کے آتے ہی حمید خان کھانا گرم کرتا۔ وہ کھانا کھانے کے بعد کچھ دیر آرام کرتی پھر باہر لان ہی میں مینجر صاحب کے پاس آجاتی اور یوں شام کی چائے دونوں باپ بیٹی مل کر پیتے۔ یہ ٹائم ٹیبل کوئی ہفتہ بھر سے چل رہا تھا۔ مینجر صاحب کو مس نعمانہ کے تقرر سے متعلق اب تک یقین نہ آتا تھا۔ وہ بار بار چاندی کے نفیس قلمدان کے نیچے رکھے ہوئے اپائنٹمنٹ لیٹر کو پڑھتے۔ پھر سامنے براس کے گلدان کے اندر لگے ہوئے پھول رنگین اور روشن ہو جاتے ـــــ اور رنگین ـــــ اور روشن ـــــ اور وہ یوں پریشانیوں کے سمندر میں رنگوں اور روشنیوں کا حصار بنائے تیرتے رہتے۔

مینجر صاحب کی طبیعت آج کچھ زیادہ ہی خراب تھی۔ وہ اسی فکر میں گم تھے کہ مینجر کسے بنایا جائے ورنہ معزز آبائی خدمت سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو جائیں گے۔ کئی افراد سامنے آتے مگر تسلی نہ ہوتی تھی۔ جو تسلی بخش تھے وہ تیار نہ ہوتے تھے۔ کہ مس نعمانہ نے آتے ہی نئی خبر سنائی۔ کالج میں نئی پرنسپل کا تقرر ہو گیا ہے اور اس نے

ایک ماہ کے اندر اندر سابقہ تعلیمی ریکارڈ مانگا ہے ـــــ یہ بتا کر وہ خود تو کھانے
میں کھانے میں لگ گئیں اور مینجر صاحب نے نئے سرے سے پائپ میں تمباکو بھرا اور
بحرِ فکر میں غوطہ زن ہو گئے۔

نئی پرنسپل نہ جانے کس مردِ حق کی مقرر کردہ تھیں کہ آتے ہی ہر چیز کو کھنگال
ڈالا۔ وہ ہر شعبے کی چھان پھٹک رہی تھیں۔ پرانے کلرک، جواب الماریوں میں رکھے ہوئے
پرانے فائلوں کی طرح بوسیدہ، کاہل اور ہٹ دھرم ہو گئے تھے نکال باہر کیا۔ بقیہ کو چند معمولی
باتوں پر ڈانٹ پلاتی۔ نوجوان کلرکوں کو زیادہ خوش اخلاق اور مہذب بننے کیلئے تنبیہہ کی۔
چپراسیوں پر ایک خونخوار ہیڈ چپراسی مقرر کیا گیا۔ لیکچررز کی پرسنل فائلیں نکلوا کر دیکھی
گئیں۔ انہیں پورے رولز اور ریگولیشنز سے آگاہ کیا گیا۔ بعضوں کو ہر سال میٹرنٹی لیوز
پر جانے کی ممانعت کر دی گئی۔ پرنسپل نے مذکورہ عمل کی تکرار پر کافی برا منایا کہ لڑکیوں پر
تعلیمی و اخلاقی اثر اچھا نہیں پڑتا۔ پرنسپل کو مزید کئی باتیں بتانا پڑیں کہ لیکچررز
شادی ہو جانے کے بعد کالج گوٹے والے کپڑے پہن کر نہ آیا کریں۔ لڑکیوں کے جذبات
مشتعل ہوتے ہیں۔ نیز جن کو ابھی شادی کی خانہ آبادی کی سعادت نصیب نہیں ہوئی
وہ طالبات کو اساتذہ کی بجائے نصاب میں دلچسپی لینے پر مائل کریں اور جن کے سابقہ
تعلیمی ریکارڈ مکمل نہیں ہیں وہ ایک ماہ کے اندر اندر مکمل کر لیں ورنہ استعفیٰ
بہ حسرت و یاس۔ ادھر مس نعمانہ کی پرسنل فائل دیکھی تو صرف سروس کی درخواست اور
ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ کا سرٹیفکیٹ نکلا مس نعمانہ نرم بھولے بھولے بالوں میں
طوطے کی چونچ کے سے ناخن سے کھجانے کے سوا کچھ نہ کر سکیں۔ پرنسپل نے لڑکیوں کی
شکایت بتائی کہ۔

"آپ کتاب میں منہ ڈالے لیکچر دیتی ہیں۔"

"جی میں نے دراصل اسی سال ایم اے کیا ہے۔"

پرنسپل نے سر سے پیر تک نظر دوڑائی۔ "بہت لیٹ ایم اے کیا ہے۔ یہ عمر تو میٹرنٹی لیوز پر جانے کی ہوتی ہے۔ خیر کوئی بات نہیں ذرا محنت کریں۔"

پھر پرنسپل کالج کے راؤنڈ پر نکلیں۔ پیڑوں کی قسمیں معلوم کیں۔ نچے کھچے پھولوں والے گملے دیکھے۔ پودوں میں چھپی بیٹھی لڑکیوں کو برآمد کیا۔ ان سے رومانی ناول اور جاسوسی کتابیں لے لیں۔ پھول جو انہوں نے بالوں اور گریبان میں سجا رکھے تھے اتروالئے اور سختی سے کہہ دیا۔

"کل سے وہ کالج آنے کی زحمت گوارا نہ کریں۔ کیونکہ طالب علمی کا زمانہ ان کے لئے ختم ہوچکا ہے۔ ان کی جذباتی عمر زیادہ ہوگئی ہے جو تعلیم میں سدّ راہ ہے۔"

اس کے بعد بغیر یونیفارم کے آنے والی اور زیادہ بناؤ سنگھار کرنے والی لڑکیوں کو قائل کیا کہ وہ لڑکیاں کم اور عورتیں زیادہ لگتی ہیں۔ لہٰذا اگر لڑکیاں ہی نظر آنا چاہتی ہیں تو کالج آئیں ورنہ تعلیم بالغاں کا ادارہ نہیں۔

اس کے بعد جب وہ ایک کمرے کا پردہ ہٹا کر اندر داخل ہوئیں تو ایک ادھیڑ عمر لیکچرر کو ایک لڑکی کے انتہائی قریب بیٹھے دیکھا۔ پرنسپل دبے پیر پسینہ پونچھتی باہر نکل آئیں خاموشی سے اپنے دفتر پہنچیں۔ کچھ دیر آرام کیا اور دھیان اچھے خیالات کی طرف لگانے کی کوشش کرتی رہیں۔ جب ذرا افاقہ ہوا تو پھر کالج کی ترقی اور بہتری کے لئے سوچنا شروع کر دیا۔

مینجر صاحب نے حسبِ عادت اس نئے مسئلہ کے سلسلہ میں اسکول کے ہیڈ ماسٹر صاحب کو پیغام بھیجا۔ خاص طور پر مس نعمانہ کی اعلیٰ تعلیم میں ان کا بڑا ہاتھ تھا۔ ورنہ وہ آج اس عہدے پر نہ ہوتیں۔ مس نعمانہ نے مڈل کے امتحان میں اسکول کے استادوں کے دست تعاون کے باعث ہی نمایاں کامیابی حاصل کی تھی۔ لیکن جب بورڈ سے میٹرک کا امتحان دیا تو تھرڈ ڈویژن میں پاس کیا۔ مینجر صاحب بہت بگڑے۔ یہ کیونکر ہو

سکتا ہے کہ جب کہ پیپر اسی اسکول کے استادوں نے سیٹ کئے تھے۔ انہوں نے ہیڈ ماسٹر کو سخت سست کہا اور سزا یہ دی کہ اب وہی مس نعمانہ کو کسی اچھے کالج میں داخلہ بھی دلوائیں۔

لیکن ماسٹر صاحب بھی جہاں دیدہ اور پہنچے ہوئے انسان تھے۔ فوراً بولے۔

"اگر اجازت دیں تو میں فیل کرواسکتا ہوں۔"

"اور پھر؟" وہ بڑے صبر وضبط سے بولے۔

"پھر آئندہ سال فرسٹ ڈویژن کرادوں گا۔"

"تو پہلے کیوں نہ بتایا کرادو فیل۔ تعلیمی ریکارڈ اچھا ہونا چاہیے، عمر کی مجھے پروا نہیں۔"

ہیڈ ماسٹر کو پہلی دفعہ مسٹر پ ق کی خدمات حاصل کرنا پڑیں۔ مسٹر پ ق بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔ وہ ہر سال کئی معذورِ تعلیم اور نابینائی علم اور اچھی ڈویژن کے متمنی طلبہ کے لئے مقررہ فیس لے کر خود امتحان دیا کرتے تھے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب اس سے پہلے کئی دفعہ انکشاف کر دینے کی دھمکی دے چکے تھے۔ جوان ہوتے تو یقیناً جذبات میں آکر استعفا بھی دے چکے ہوتے اور مسٹر پ ق کو گرفتار بھی کروا دیا ہوتا لیکن کچھ تو اس جنونی دور سے گزر چکے تھے اور کچھ بہت سی ذمے داریوں کے بوجھ تھے۔ خود اپنے نالائق بیٹے سے متعلق بھی یہی سوچنا پڑ رہا تھا۔ اس لئے انہوں نے کافی سوچ بچار کے بعد ہی مسٹر پ ق کو تکلیف دی تھی۔

مسٹر پ ق بڑے احترام سے پیش آئے۔ لذیذ چیزوں سے تواضع کی۔ پھر مس نعمانہ کے مضامین دریافت کئے اور بہت تسلی دی۔

اب تک مسٹر پ ق نے صرف لڑکوں کے لئے ہی امتحان دئیے تھے۔ اس مرتبہ انہیں پہلی بار اپنے پیشے کو وسعت دینے کا خیال آیا۔ وہ خواتین کے اس جدید میک اپ سے

واقف نہ تھے جس سے مردوں کے سے سخت تراشیدہ رویئں بھی چھپائے جا سکتے ہیں۔ ورنہ خود ہی یہ امتحان بھی دے لیتے۔ انھوں نے اپنی کزن کو پیش کش کر کے حصہ دار بنالیا۔

اس طرح مس نعمانہ نے دوسرے سال میٹرک فرسٹ کلاس میں پاس کر لیا اور انہیں اچھے کالج میں داخلہ مل گیا۔ سال بھر کی رپورٹ تو تسلی بخش رہی لیکن سالانہ امتحانات میں مس نعمانہ پھر صرف ایک مضمون پاس کر سکیں اور پرنسپل نے فرسٹ ایئر میں بھی داخلہ دینے سے انکار کر دیا مگر مینجر صاحب دکھتی رگ سے واقف تھے۔ انھوں نے فوراً ایک نامی کمپنی سے پانچ ہزار روپے کی رقم دلوانے کا وعدہ کیا تب کہیں مس نعمانہ کو پھر سے تعلیم جاری رکھنے کی اجازت ملی۔

کچھ عرصہ چین سے گزر گیا اور انٹر سائنس سیکنڈ ایئر کے امتحان کے لیے اسکول کے استادوں کو طلب کیا گیا اور مس نعمانہ کو پڑھانے کے فرائض سونپے گئے۔ وہ ہمہ وقت مس نعمانہ کے آگے پیچھے رہتے۔ ورنہ تنخواہ کے متاثر ہونے کا خدشہ تھا۔

یوں مس نعمانہ سوائے انگریزی کے سارے مضامین میں پاس ہو گئیں۔ دراصل اس پرچے میں کچھ آؤٹ آف کورس الفاظ آ گئے تھے۔ ایسے الفاظ ان کی نصاب کی کتاب میں کہیں نہیں آئے تھے۔ اس لئے کچھ لڑکوں نے واک آؤٹ کر دیا تھا مگر مس نعمانہ چند لڑکیوں کے ساتھ پرچہ حل کرتی رہی۔ لہذا انہیں ایس بیس نمبر گریس میں دے کر پاس کر دیا گیا۔ بی اے میں آکر مس نعمانہ کافی ایکٹو ہو گئیں۔ اسٹیج پہ آئیں۔ انتخابات میں حصہ لیا۔ سالانہ کھیلوں میں کپ جیتا۔ گانا سننے کا شوق تھا۔ ذرا سی مشق پہ گانے لگیں اچھا پہننے کا شوق بچپن ہی سے تھا لہذا لڑکیوں میں مقبول ہو گئیں۔

سال گزرتے پر نتیجہ آیا تو سارے مضامین میں پاس تھیں۔ مینجر صاحب کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ اسکول میں بچوں اور استادوں میں مٹھائی تقسیم کی گئی۔

لیکن جب مارک شیٹ نکلوائی تو پتہ چلا کہ صرف وہی مضامین میں پاس ہیں اور

دو میں فیل۔ مینجر صاحب نعمانہ کی اعلیٰ تعلیم سے پھر مایوس ہو گئے اور خود ساختہ

شاندار محل مسمار ہوتے نظر آنے لگے۔ ان کے پاس الہ دین کا چراغ نہ تھا لیکن کچھ اس

قسم کی قوت ضرور تھی جس کی بنا پہ جھٹ ہر مسئلہ کے حل کے لئے ہیڈ ماسٹر صاحب کو

بلا لیتے۔ اور وہ کچی ڈوری میں بندھے چلے آتے۔

ماسٹر صاحب تو یہ معاملہ ہے۔ مس نعمانہ کو فرسٹ ڈویژن دلوا دو۔"

ہیڈ ماسٹر نے وہیں بیٹھے بیٹھے میں نے پ ق کو فون پر بلایا تو وہ نہیں ملا۔ چھان

بین کے بعد معلوم ہوا کہ وہ دو تین سال کے بعد شہر بدل لیتے ہیں تا کہ سماج دشمنوں کی گرفت

سے بچے رہیں۔ پچھلے سال سے کسی دوسرے شہر کے امتحانوں میں شرکت کرنے گئے تھے۔

لہٰذا استادوں ہی کو پڑھانے پر مامور کیا گیا۔

لیکچررز اور پرنسپل کے تیور بدل گئے تھے۔ خود مس نعمانہ کا دل اچاٹ ہو گیا تھا۔

ہر وقت کی پڑھائی سے۔ اس لئے کلاسیں بہت کم اٹینڈ کرتیں۔ سال کے آخر میں پتہ چلا

کہ حاضریاں بہت کم ہیں۔ پرنسپل صاحبہ نے امتحان میں شرکت کا فارم روک لیا۔ لیکن یہ کافی

معمولی بات تھی۔ مینجر صاحب نے انتظام کر لیا۔ اساتذہ منہ دیکھتی رہ گئیں اور مس نعمانہ

کو امتحان میں شرکت کی اجازت مل گئی۔

اس سال بھی طلبہ نے حسب عادت مظاہرے شروع کر رکھے تھے۔ اس سال ان کے

مطالبے کچھ نئے تھے۔ تعلیم کا معیار بڑھا کر طلبہ کے لئے ذہنی پریشانیوں میں اضافہ کیا جا

رہا ہے۔ انہیں مطالعہ کے لئے زیادہ وقت دینا پڑتا ہے۔ نصاب کی کتابیں کم کی جائیں

امتحانوں میں وقفے کم ہیں۔ امتحانوں کی تاریخ بڑھائی جائے۔ ہر مضمون کے لئے کم از کم

ایک ہفتہ کا وقفہ ہو۔ طلبہ کو ہمیشہ فرسٹ اور سیکنڈ کلاس میں پاس کیا جائے۔ تھرڈ

ڈویژن اور فیل کرنے کا سسٹم ختم کیا جائے۔ اس سے طلبہ کا دل دکھتا ہے۔

جب مظاہرے بڑھ گئے تو حکام تعلیم کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا اور تاریخ بڑھا دی گئی تا کہ طلبہ سال بھر کی مصروفیت کے بعد کچھ مطالعہ کر کے پاس ہو سکیں۔

اس وقفے میں مس نعمانہ نے واقعی دل لگا کر پڑھا اور سارے مضامین میں پاس ہو گئیں۔ سوائے انگریزی کے پرچے کے۔ اس دفعہ انگریزی کے پرچے میں ہر سوال کے ساتھ اتنا چوائس تھا کہ انتخاب کرنا مشکل ہو گیا تھا۔

مس نعمانہ کو ہسٹری سے زیادہ دلچسپی تھی۔ انہیں یونیورسٹی میں داخلہ مل گیا اور اگلے سال انگریزی کا پرچہ دینے کی اجازت بھی مل گئی۔ مگر وہ اگلے سال بھی اس پرچے میں رہ گئیں۔ ایم اے فائنل کے ساتھ ایک موقع اور دیا گیا۔

تیسرے سال ایم اے تو مس نعمانہ نے سیکنڈ ڈویژن میں پاس کر لیا لیکن انگریزی کے پرچے میں بدستور فیل رہیں۔ یوں ایم اے پاس تھیں اور بی اے ادھورا یعنی فیل۔

مینیجر صاحب نے ہسٹری کے ہیڈ ڈیپارٹمنٹ سے مس نعمانہ کا سرٹیفکیٹ لے کر کالج میں تقرر تو کرا دیا تھا۔ لیکن اس غائبانہ روح کو گرفت میں نہ لا سکے تھے جس نے نئے پرنسپل کو اس کالج میں وارد کر کے ان کی نیک آرزوؤں پر ایٹم بم پھینک دیا تھا۔

مینیجر صاحب میٹرک کا سرٹیفکیٹ دیکھ کر دیر تک دیکھتے رہے، سوچتے رہے۔ انٹر کا سرٹیفکیٹ یہ سوچ کر رکھ لیا گیا کہ گریس مارکس بیس کبھی نہیں ملا کرتے۔ یہ مسئلہ زیر غور رہے۔ انٹر کا انگریزی پرچہ پاس کرنا پڑے گا۔ لیکن اس سے زیادہ انہیں بی اے کی ڈگری سے متعلق پریشانی تھی۔ انہوں نے چائے پی کر پائپ میں تمباکو بھرا۔ اور آرام کرسی پر ٹیک لگائے ہیڈ ماسٹر کا انتظار کرنے لگے کہ اسی وقت ماسٹر صاحب دبے پیر دبیز پردے ہٹا کر اندر داخل ہوئے اور کانپتے ہاتھوں سے ایک لفافہ اور اخبار آگے بڑھا دیا۔

"مسٹر پی جو دس سال سے ضرورت مند طلبہ کے لئے امتحانات

دیتے رہے ہیں۔ ڈرامائی انداز میں گرفتار کر لئے گئے۔ گزشتہ تمام فراڈ سے حاصل کی ہوئی ڈگریاں ضبط کر لی جائیں گی۔ نیز عدالتی کارروائی کی جائے گی۔"

چنانچہ شام کو مینجر صاحب نے پھر میٹنگ طلب کی ہوئی تھی اور ہیڈ ماسٹر صاحب کو کافی تشویش تھی کہ میٹنگ ہو بھی سکے گی کہ نہیں۔ اگر ہوئی تو مینجر صاحب کیا فیصلہ کریں گے۔ لیکن انہوں نے اخبار دیکھنے کے بعد ماسٹر صاحب سے کوئی بات نہ کی۔ آنکھیں بند کر کے ٹیک لگا لیا اور وہ چلے آئے۔

اسی شام اسکول کے منتظمین، اساتذہ اور برادری کے چند حضرات سب جمع تھے ان سب کی توقع کے خلاف مینجر صاحب گہرے سوٹ میں ملبوس بہت چاق و چوبند اور خوش نظر آرہے تھے۔ پائپ منہ میں دبائے خوش دلی سے باتیں کرتے رہے۔ سب ہی بے چینی سے منتظر تھے کہ اس میٹنگ میں کون سا اور فیصلہ کیا جاتا ہے۔ اسکول کی باگ ڈور کس کے ہاتھ میں سونپی جاتی ہے۔ کہ مینجر صاحب نے تپائی پر ہاتھ رکھا۔ کھنکار کر گلہ صاف کیا۔ اور مخاطب ہوئے۔

"میں نے نئے مینجر کا انتخاب کر لیا ہے۔ مس نعمانہ کل سے میرے فرائض انجام دیں گی۔ وہ کسی طرح ہم سے کم نہیں۔ آخر مڈل پاس تو ہے"

دوسرے ہی لمحے ہال تالیوں سے گونج رہا تھا۔

افکار۔ ۱۹۷۱ء

ایک خواب تین لمحے

اُف ڈراؤنا خواب بھی۔ کس قدر ڈراؤنا ہوتا ہے! خواب کا سلسلہ ٹوٹتے ہی اس نے سکون کا سانس لیا۔ آنکھیں کھول کر دیکھا تو وہ پیلے روغنی پھولوں کی کیاری کے پاس موزائیک کے چنکبرے فرش پر پڑا تھا۔ "معاشیات کے اصول"، کتاب پرے یوں پڑی تھی جیسے کتابڈی چھوڑ کر پھینک گیا ہو۔ صبح کے اس پُرسحر اندھیرے میں پیلے پھول مدھم بلب کی طرح روشن تھے۔ اس نے فوراً اپنے رخساروں پر ہاتھ پھیرا۔ رات کے آنسو خشک ہو چکے تھے۔ خواب۔ ہاں خواب ٹوٹ چکا ہے۔ اچانک خوشی سے اسے اپنا سینہ پھولتا محسوس ہوا۔ سڑک کے چوراہے پر گھاس کے وسیع دائرہ میں خوبانیوں کی سی بتیاں جل رہی تھیں جن کی روشنی میں وہ پڑھتے پڑھتے سو گیا تھا۔ وہ آنکھیں ملتا ہوا اٹھ کر اکڑوں بیٹھ گیا۔ پھر گھٹنوں پر سر رکھے انتہائی طمانیت کے احساس سے سامنے دیکھنے لگا۔ ہوا کے نرم جھونکوں اور پُراسرار مانوس سی خوشبو سے کتنے احساس جاگ اٹھے تھے۔ اس نے خوشیوں اور خوشبوؤں کی لطیف فضا میں خود کو

اڑتا محسوس پایا۔ ایک عرصہ کے بعد اسے اتنا حسین سویرا نصیب ہوا تھا۔ ڈینیا کے قرمزی اور پیلے پھول ہوا کے جھونکوں سے گھاس پر بچھے بچھے جاتے تھے۔ اس نے مشرق کی جانب سیدھی سرمئی سڑک کو دیکھا۔ سامنے سرمئی مثلثوں پر وسیع سرخ پٹی پھیل گئی تھی۔ پھر اس پٹی کے نارنجی رنگ میں تبدیل ہوتے ہی پیتل کا نصف تھال تیرتا ہوا پہاڑی پر آن رکا۔ دیکھتے ہی دیکھتے پورے تھال سے روشنیوں کے فوارے نکلنے لگے کیا صبح روز اسی طرح ہوتی ہے۔ اس نے آنکھیں مل کر پھر چاروں طرف دیکھا۔ گھاس کے وسیع قطعہ پر شفاف شعاعوں نے ہری گھاس میں کیسا سنہری پن بھر دیا تھا۔ سیم کے بیج کی مانند تالاب میں پیلے کنول کتنے مغرور لگ رہے تھے۔ سرخی مائل پتے ہرے پانیوں میں کنول کے لئے پتوار بنے پھیلے تھے۔ گول بیضوی اور سوراخ دار سنجیدہ رنگوں کے پتھروں سے سڑل سڑل کی آواز کتنی بھلی لگ رہی تھی۔ بادام کے درختوں پر چڑیوں نے چہچہار مچا رکھا تھا۔ وہ جھومتا ہوا اٹھا اور کتاب اٹھا کر چل دیا۔

اٹھ کہ خورشید کا سامانِ سفر تازہ کریں

نفسِ سوختہ شام و سحر تازہ کریں

وہ اپنا ناتواں سینہ پھلا کر دائیں بائیں دیکھتا، پیر جماتا، فٹ پاتھ کے کنارے کنارے چلنے لگا۔ صاف شفاف سڑک پر گاڑیوں کی تعداد بڑھنے لگی۔ چھوٹی بڑی رنگ برنگی گاڑیاں۔ کیسی خوب صورت لگ رہی تھیں۔ ایک بڑی سی بادامی گاڑی بحری بیڑے کی طرح قریب سے تیرتی گزر گئی تو اس نے انتہائی خوش ہو کر مصمم ارادہ کر لیا کہ اس گاڑی میں کبھی نہ کبھی ضرور سوار ہو گا کہ اتنے میں اسکوٹر اور سائیکل سواروں کا ریلا آ گیا۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتا کتاب بغل میں دبائے بڑھتا چلا گیا۔ اس کے خیالات میں ایسی تیزی اور جولانی پہلے تو کبھی نہ آئی تھی۔ صبح کی یہ کیفیت کتنی مقدس اور جذبوں کو جگانے والی تھی۔ لیکن سے نہ

ہی یہ آسودگی کا کیسا احساس تھا؟ ـــ جیسا ـــ جیسا سمندر کی لہروں میں ڈولتے لنگر پر بیٹھے ہوئے سفید پرندے کو دیکھ کر لطیف آسودگی کا احساس پیدا ہوتا ہے شاید؟

سامنے بس اسٹاپ پر دوپٹہ اوڑھے کمسن سانولی سی لڑکی کتابیں اٹھائے کھڑی ہے۔ سادہ اور معصوم جوہی کی ننھی منھی منہ بند کلیوں کی طرح ـــ جب وہ شہر آیا تھا تو وہ اسی عمر کا ہوگا۔ باپ اسے تعلیم دلانے کے لئے لایا تھا۔ گاؤں کی صبحیں ایسی ہی مدھ بھری ہوتی ہیں۔ وہ چپکے سے کھیتوں میں گھس کر مولی، گاجریں اور شلجم اکھاڑ کر لاتا تھا۔ جب دینو لنگڑاتا ہوا گنے کا ٹوٹا گھماتا پیچھے دوڑتا تو وہ درخت پر چڑھ جاتا تھا۔ ان دنوں اسے کپاس کے پھول توڑ کر دھاگہ بٹنے کا شوق ہوگیا تھا۔ اسے خیال ہوا تھا کہ کپاس سے پتنگوں کے لئے خود مضبوط ڈورے بنائے گا۔ ایسا مانجھا کہ تلوار کی طرح کاٹ کر گڈیوں کے ڈھیر لگادے ـــ ایک بار امتحان ہو جائیں وہ جہاز رانی میں تربیت حاصل کرے گا ـــ یا ـــ یا کوئی ایسی ملازمت جس سے وہ بحری جہاز میں دنیا بھر کی سیر کرے ـــ جہاں بادلوں کی چھت اور نیلے مٹیالے پانیوں کا فرش ہوگا۔ اور سفید پالے کی طرح چمکتے پروں والے سفید کبوتر اور فاختائیں۔ زندگی کتنی مکمل ہوگی! ـــ وہ اپنی چاند ستارے والی بڑی سی پتنگ کو کتنا عزیز رکھتا تھا۔ وہ جو وسیع و عریض آسمان کے سینہ پر ڈولتی اور تن کر کھڑی ہو جاتی تھی۔ کیا وہ اس نیلی دبیز چھت پر نہیں اڑ سکتا ـــ وہ نہیں میں جاؤں گا۔ میں اڑوں گا۔ پھر سات آسمان پار کرکے وہیں جا پہنچوں گا۔ جہاں کے قصے ماں سنا سنا کر پریشان کر دیتی ہے۔،، وہ ہمہ وقت خوش لباس پریوں اور جنوں کے تصورات میں کھویا رہتا تھا۔ پتنگ کی ڈور تھامے گھنٹوں منہ اٹھائے دیکھتا رہتا۔ پھر پتنگ کی ڈور انگوٹھے میں باندھ کر وہیں لیٹ جاتا ـــ اماں ـــ سنو ـــ سنو، میری پتنگ پر پریوں

کے آنسو ہیں۔ وہ خنکی کی بنا پر ٹھنڈی پتنگ کو چھو کر اچھلتے ہوئے کہتا ـــــ اس نے بادلوں سے جھانک کر اللہ میاں کو بھی دیکھ لیا ہوگا نا؟

"نہیں بیٹے۔ اللہ میاں نظر نہیں آتے۔"

"اچھا ـــــ چا ـــــ اسے سخت نا امیدی ہوتی ـــــ اللہ میاں کا اس قدر چرچا ہوتے ہوئے بھی نظر نہیں آتے۔ یہ کیسی عجیب بات ہے! میں جاؤں گا ـــــ ہر جگہ ڈھونڈوں گا۔ دیکھ کر رہوں گا۔" وہ دھم دھم زمین پر پیر تا مارتا۔ اس کا باپ انتہائی نیک اور سیدھا سادھا تھا۔ اس کی ایسی باتیں سن کر ملول ہو جایا کرتا تھا۔

سامنے سڑکوں کے بیچ چھوٹی سی وین پر کیلوں کے گچھے بھرے تھے اور ایک طرف بیٹھا شیدی نہ جانے کیا گیت گا رہا تھا۔ خوشی کی ایک اور ننھی لہر اس کے جسم میں دوڑ گئی۔ فٹ پاتھ پر ایک طرف مزدوروں کی ٹولی کھچی کی ٹوکریاں تھامے تیز تیز قدموں سے رواں تھی۔ ان کے پیچھے ڈھیلے ڈھالے لباس میں عورتوں کا قافلہ تھا۔ پھول دار لباس اور رنگین اوڑھنیوں میں چلتی کیسی قوس قزح کا بھنور لگ رہی تھی۔ شیشہ جڑے سنہرے "بلاق" باتیں کرتے اور ہنستے میں ان کی ناک میں جھول رہے تھے۔ سب ہی کس قدر مستعد تھے۔ سر اٹھائے سامنے اوپر دیکھتے طمانیت کے احساس کے ساتھ چلے جا رہے تھے۔ جب وہ اپنی جائے رہائش پر پہنچا تو فروٹ والے اپنے ٹھیلے سجا رہے تھے۔ شاہو بابا گداگر اسٹول پر انگور کا گچھا تھامے بھنے چنوں کی طرح انگور پھانک رہا تھا۔ بوڑھی زینب اسی لگن سے جوتے سی رہی تھی۔ زندگی کتنی رواں دواں تھی۔ زندگی نعمت ہے۔ دولت ہے۔ صبح صادق کی طرح پُر سحر و دلفریب۔ انگور کے دانوں کی طرح رس بھری اور گولڈ مہر کے شگوفوں کی طرح شوخ و شنگ۔

اُف! ڈراؤنے خواب سے زیادہ اذیت ناک کیفیت شاید ہی کوئی ہوتی ہو۔

آنکھ کھلتے ہی اس کا دل ڈوبنے لگا۔ بلب کی دھیمی روشنی میں ہر شے کتنی پُر اسرار نظر آرہی تھی۔ اس کی بیوی کی بخار میں جلتی ہوئی سانس سے اسے کمرے کی فضا تنور کی طرح تپتی محسوس ہوئی۔ وہ کھسک کر پرے ہو گیا اور اسے گھور کر دیکھنے لگا۔ دھیمی روشنی اور گھٹی فضا میں وہ انتہائی بھیانک لگ رہی تھی اسکے بال کھلے تھے اور کمزوری کی وجہ سے منہ اور آنکھیں نیم وا تھیں ـــــ جیسے ـــــ جیسے کوئی بھوت پریت کی کہانیوں کی ہیروئن کیا یہ وہی خوب صورت لڑکی ماہ طلعت تھی جو ـــــ جو ایک بار دوپٹہ اوڑھے کتابیں اٹھائے بس اسٹاپ پر نظر آئی تھی ـــــ کون کہہ سکتا ہے ـــــ اس نے ڈرتے ڈرتے اسے کلائی سے پکڑا اور اس کی نبض دیکھی۔ لیکن اس کا دل اس زور سے دھڑک رہا تھا کہ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ اس نے ماہ طلعت کو کروٹ سے لٹانا چاہا تو وہ خوف زدہ ہو کر اس سے لپٹ گئی۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں وحشت برس رہی تھی۔ اسے آہستگی سے لٹا کر وہ اکڑوں بیٹھ گیا اور گھٹنوں سے سینہ دبائے دیکھنے لگا۔ اس کے چاروں بچے گہری نیند سو رہے تھے۔ طارق اور عابد کیسے بکھرے بکھرے پڑے تھے اور دونوں بچیاں الگ الگ پلنگ پر اوندھی پڑی تھیں۔ بوڑھی ماں کے کھانسنے کی آواز آرہی تھی۔ وہ اٹھ کر آہستہ آہستہ قدم بڑھاتا پانی کا گلاس ماں کے پاس لے گیا۔

"تم اب تک جاگ رہے ہو ـــــ" ماں نے درد سے ڈوبی آواز میں پوچھا۔

"میں بھی تو ہر وقت کھانستی رہتی ہوں ـــــ تم جاگ جاتے ہو گے !" وہ بے حد تاسف سے بولیں۔

" ماں ـــــ ماں مجھ سے محبت کرنا چھوڑ دو اب۔ اتنا نہ چاہو کہ ـــــ وہ دانت بھینچ کر قدرے زور سے چیخا ـــــ" میں محبت کا اتنا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔ میری کاٹھی کمزور ہے اور چھوٹی بھی ـــــ" یہ رات کا آخری پہر تھا۔ صبح ہوا، اسی

چاہتی تھی۔ اس نے مغرب کی طرف کھلنے والی کھڑکی کھول دی۔ نرم ہوا کے جھونکے اندر آنے لگے — باہر بھی ہیبت ناک سناٹا تھا۔ دیواریں ہی دیواریں تاریکی میں ڈوبی — سیاہ چھتیں — سیاہ درخت اور سیاہ آسمان — وہ گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ بلیوں کے غرانے اور کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آنے لگیں۔ اسے اپنا بدن ٹوٹتا محسوس ہوا۔ واپس آکر پلنگ پر لیٹ گیا — روشن دان سے جب دھوپ کا سایہ عین چہرے پر آگیا، تو اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ چمکتی دھوپ میں آنکھیں کھولنا اسے بے حد ناگوار لگا۔ بچے بے طرح شور مچا رہے تھے۔ ماہ طلعت باورچی خانے میں بیٹھی روٹیاں پکا رہی تھی۔ ماں تسبیح ہاتھ میں لئے بچوں کو چپ کرانے کی کوشش کر رہی تھی۔

اسے آتا دیکھ کر دونوں لڑکے کشتی لڑتے لڑتے سہم کر ایک طرف کھڑے ہو گئے۔ بڑی لڑکی ماہ طلعت کی ٹانگ سے لگ کر اب تک رو رہی تھی اور چھوٹی ابھی جاگی نہ تھی۔ کھانے کی چوکی پر شوربے میں تیرتی ترکاری اور روٹیاں رکھی تھیں۔ وہ ناشتہ کر کے بوجھل قدموں سے اپنی دکان کی طرف چل پڑا۔ کیا اس نے ایسی زندگی سے متعلق کبھی سوچا تھا؟ — اس کی دکان میں گھی اور سرسوں کے تیل کا اسٹاک کم ہو چلا تھا اور چند دن پہلے ہی ان کی قیمتیں آسمان تک پہنچ گئی تھیں۔ گاؤں سے اس کے آدمی اب تک گھی نہیں لائے تھے۔ دکان کھلتے ہی لوگوں کی بھیڑ لگ گئی۔ جلدی میں وہ ھٰذا من فضل ربی کی تختی بھی سیدھی نہ کر سکا اور گاہک نمٹانے لگا۔ اس نے کئی بار نیت کر کر ملاوٹ کا ارادہ کیا لیکن باپ کی تربیت آڑے آجاتی اور بنی بنائی اسکیم پر پانی پھر جاتا۔ ایک رات تو اسٹاک کم ہونے پر اس نے ملاوٹ بھی کر ڈالی کہ اسی روز صبح قانون نافذ ہو گیا اور ملاوٹ کرنے والے کے لئے دس سال قید بامشقت کی سزا سنائی گئی۔ اس نے سارے پیپے لنڈھا دئیے۔ گھی نا پیو

ہیں بہتا پھرا۔ وہ کرسی پر گم صم بیٹھا رہتا یا اخبار پڑھتا رہتا۔ اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے دنیا کی ہر بیماری اس پر حملہ آور ہو گئی ہے۔ وہ سدا سے بیمار ہے دنیا میں کسی شے کی کوئی حقیقت نہیں۔ ہر شے کا وجود دوسرے کے حوالے سے ہے اور اس کا دوسرا بھی کوئی نہیں ہے۔ کیا میں ہنس سکتا ہوں۔ لیکن ہنسی محض چہرے کے پھیلاؤ کا نام نہیں ہے ـــــ مجھے خوشی کی تلاش ہے ـــــ کیا مجھے خوشی سکھ مل سکتا ہے۔ چند لمحے ہی سہی۔ میں ان لمحوں کو اپنے اندر سمیٹ کر آگے بڑھنے کی کوشش کروں گا۔ اس کی اپنی دوکان کس قدر بوسیدہ ہے جیسے صدیوں پرانی کسی شے کا مدفن۔ اس کے کواڑ موٹے اور بھدے تھے۔ جیسے جیل کی کوٹھڑیوں کے دروازے۔ قفل زنگ آلود ڈبے معلوم ہوتے تھے۔ اس کے جسم کے ہر حصے میں نبض گھڑی کی ٹک ٹک کی طرح بج رہی تھی ـــــ وہ گھر لوٹا تو طارق اور عابد لوٹی ہوئی پتنگ پر لڑ رہے تھے غصہ سے اس کا خون کھول گیا۔ اس نے پتنگ کی دھجیاں اڑا دیں اور دونوں بچوں کو دھکا دے کر گرا دیا۔ پھر پاگلوں کی طرح چیختا صحن میں چکر لگانے لگا۔ پھر تھک کر ڈیوڑھی کی چوکھٹ پر بیٹھ کر سہمے ہوئے بچوں اور پھٹی پتنگ کے ٹکڑوں کو دیکھتا رہا۔ آخر کار آہستگی سے اپنی جگہ سے اٹھا۔ دونوں بچوں کو ننھے ہاتھوں میں اپنی شہادت کی انگلی تھما کر بازار چل دیا۔ انہیں رنگین پتنگیں اور ڈور دلوائی۔ ڈور سے لپٹی چرخی اور پتنگیں لئے وہ کوٹھے پر آ گئے۔ گہری شام تک تینوں باپ بیٹے پتنگ اڑاتے رہے۔ نیلے آسمان کی دبیز چھت پر ـــــ بسیط فضا میں پتنگیں ڈولتی رہیں۔ اس کے بیٹے مارے خوشی کے اس سے بار بار لپٹ جاتے اور ایسی ہی باتیں کرتے جیسی وہ کیا کرتا تھا ـــــ اس کے دونوں بیٹے کتنے ذہین تھے۔ لڑکیاں کتنی خوب صورت ـــــ بیوی صابر اور سلیقہ شعار ـــــ ماں نیکی کی کہانیاں سنانے والی ـــــ ہاں زندگی دلفریب ہے لیکن قربانی چاہتی ہے۔ محنت، لگن، عشق۔ اس کے بچوں نے پتنگوں

کا وہ ڈھیر دکھایا جو انہوں نے چھپ چھپ کر خود بنائی تھیں۔ داس طرح کی،اس کے بڑے بچے کا چہرہ پتنگ اڑاتے وقت خوشی و جوش سے سرخ اور پسینہ میں تر بتر تھا۔زندہ رہنے کے لئے لگن اور جذبہ کیسی انمول کیفیتیں ہیں!۔۔۔ اس کے بچے بیوی ماں۔کیسی خوب صورت۔ سہ رنگی پتنگیں ہیں۔تلوار کی سی دھار جیسے مانجھے میں بندھی۔ وہ ہر چیز کو ایک بار پھر یوں بغور دیکھنے لگا جیسے ابھی ابھی خواب سے جاگا ہو۔ نئی قوت کے تحت وہ دن بھر محنت اور لگن سے کام کرنے لگا۔اسی ولولے اور نئے عزم کے ساتھ زندگی گذارنے کا ارادہ کئے انتہائی خوش خوش کام سے لوٹا تو اس کے سر میں شدید درد اٹھا۔ وہ چلانے لگا۔صرف ایک لمحہ اور۔ میں نے ابھی دو ہی لمحے گذارے ہیں۔ انتہائی غیر یقینی۔صرف ایک لمحہ اور زندہ رہنے دو میرا تیسرا لمحہ میرے اپنے اور دوسروں کے لئے ہوگا۔۔۔صرف ایک لمحہ اور۔۔۔ لیکن وہ مر گیا۔۔۔

افکار ۱۹۷۱ء

اپنا اپنا دامن

چھوٹا سا ہرا بھرا لان بھی تھا اور چنبیلی کی ننھی ننھی کلیاں بھی بیضوی تالاب پر جھکی رہتی تھیں۔ جس میں دھلے دھلائے گلابی کنول تیرتے تھے لیکن خواب دیکھنے والی لڑکی بھلا ایسے شوہر کا تصور بھی کر سکتی تھی۔ اس کا جی چاہا کہ بس سیدھے سیدھے مر جائے۔ نانی اماں اس کی شادی کے غم میں گھلی جا رہی تھیں۔ ایسا بھی کیا تھا ہر انسانی بچے کی شادی ایک نہ ایک دن ہو ہی جاتی ہے۔ (بس تو تمہاری بھی ہو گئی یاسمین کا مر ثیہ!)

"سنئے کیا میں آپ کو اچھا لگا ہوں۔" اس کے شوہر نے اس کا گھونگٹ اٹھاتے ہی پوچھا تھا اور آواز بھی کانپ رہی تھی۔

"ارے یہ تو دلہن کے دل کی آواز ہوتی ہے اور یہ بات اس کا شوہر اس سے پوچھ رہا تھا۔"

یاسمین کو اپنا دل پسلیوں سے سر پھوڑتا محسوس ہوا۔ ہمت کر کے آنکھیں کھولیں

اور اس کا دل ڈوب گیا وہ کیسی شکستہ شکل لئے بیٹھا تھا جیسے مجمع منتظر ہو اور مداری والے کا طوطا کسی طرح بھی توپ چلانے پر آمادہ نہ ہو۔ شمیم کیسی بھولی بھالی باتیں کرتے رہے اپنے دکھوں اور پریشانیوں کی باتیں۔ اس کا ذرا بھی جی نہ چاہا کہ وہ یہاں بھی اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کی طرح شمیم کی تربیت شروع کر دے۔ وہ زاہد کو امی ابا کے انتقال کے بعد کتنا ہی سمجھاتی رہتی تھی۔ مرد ہو تمہارے کندھوں پر سب کا بوجھ ہے۔ مزاج میں پختگی پیدا کرو نہ جانے کیا کیا۔ تو اب کیا یہاں بھی۔ یہاں بھی شمیم صاحب کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر سمجھانا شروع کر دے۔ تم مرد ہو۔ تم میں اعتماد کی بے حد کمی ہے۔ احساسِ کمتری پہ غالب آ کر اپنی تعمیر کرو وغیرہ وغیرہ۔ وہ کیسے کیسے خیالوں میں گم رہنے لگی۔ بات کرنے کو جی نہ چاہتا یہ کیسی زندگی ہوگی۔ نہ جانے کیسی۔ وہ رات بھر جاگتی اور دن بھر خاموش رہنے لگی۔

دلہن اب تو بہت دن ہو گئے کچھ ہنسا بولا کرو۔ میرا شمیم اب تمہیں گھمانے پھرانے بھی لے جاتا ہے۔'' امی بولیں۔

ہائے تو امی کو بھی شکایت پیدا ہونے لگی نا مجھ سے۔ میں کیا بولوں۔ کیسے بولوں اسے یوں لگا جیسے اس کا دل پھٹ جائے گا۔ وہ اپنے آپ کو قتل کیوں نہیں کر دالتی امی جان کی بات سن کر طنزیہ ہنسی بھی نہ ہنس سکی۔ سب ایسا کیوں سمجھتے ہیں کہ لڑکیاں یوں آسانی سے بہل جاتی ہیں۔ کیا ہم واقعی اتنی بے وقوف ہوتی ہیں کہ کپڑے۔ گھر، سیر و تفریح سے۔ اسے یاد آ گیا۔ گزشتہ روز جب وہ کلفٹن کے پل پر سے اتر رہے تھے تو شمیم عجیب بچوں کے سے انداز میں سیڑھیوں پر سے اچھلنا پھلنگتے لگاتا آگے بڑھ جاتا۔ ''سنو یاسمین میں تمہیں کیسا لگتا ہوں۔ ابا کا مزاج اتنا تیز ہے کہ میں ان کا سامنا ہی نہیں کر سکتا اور پھر بچے۔ وہ بھی انتہائی بدتمیز ہیں۔ میرا احترام نہیں کرتے۔''

وہ یوں بتا رہا تھا جیسے کوئی بچہ اپنی استانی جی سے شکایت کر رہا ہو ــ وہ خاموش سنتی رہی ــ کوئی جواب نہ پا کر یاسمین کا ہاتھ چھوڑ کر خاموش چلنے لگا۔ "آپ کچھ کھائیں گی۔" وہ تم سے آپ پہ آگیا تھا لیکن وہ بدستور خاموش رہی۔

"بھئی آپ بہت شرماتی ہیں۔"

ہائے میں تو تمہاری بیوی ہوں ــ کوئی بیوی کی سہیلی تو نہیں ــ اس نے دل میں کہا۔

وہ دونوں کچھ دیر سمندر کی مچلتی لہروں کے قریب کنارے پہ چہل قدمی کرتے رہے تھے لیکن دو اجنبیوں کی طرح جو مختلف خطۂ سرزمین سے تعلق رکھتے ہوں ــ ابا جان اس گھر کی کیسی عجیب شخصیت تھے جو زیادہ تر اپنے کمرے میں بند رہتے تھے۔ انہوں نے آج تک اس سے بات نہ کی تھی ــ ایسا سسر اس نے کبھی نہ دیکھا تھا نہ سنا تھا ــ خیر ان کی اسے کیا پرواہ! لیکن اس کا اپنا شوہر ــ کیونکہ ایسا تھا ــ سہما ہوا بچہ! جسے اب تک ماں کی ضرورت تھی ــ ابا جان شام کو آتے ہی شمیم کو آواز دیتے۔ "حلیم بھر لاؤ!" اور شمیم سست قدم اٹھائے چل پڑتے۔ شکو اور زرینہ دیکھ کر ہنسنے لگتے۔ اس نے کبھی ایسا تصور بھی نہ کیا تھا۔ آخر اس نے خیالی تصویریں کس بنیاد پہ بنائی تھیں۔ کم از کم اتنا تو ہوتا کہ دونوں اپنا اپنا بوجھ اٹھاتے ــ اتنا تو ہوتا کہ وہ اپنے آپ کو کسی کی حفاظت کسی کی پناہ میں تصور کر سکتی ــ اور اس چار دیواری کی تو چھت ہی غائب تھی۔

"دلہن خوش رہا کرو ــ میرا شمیم تو تم پہ جان چھڑکتا ہے ــ اور تم ہو کہ ــ کیا کمی ہے اس میں آخر ــ تمہیں چھ ماہ ہونے کو آئے اور تم ایسی پرائی لگتی ہو۔" امی جان پھر کہہ رہی تھیں ــ اور نانی جان جتنی شادی سے قبل پریشان تھیں۔ شادی کے بعد کہیں زیادہ پریشان تھیں۔ بیٹھے بٹھائے لڑکی کو چپ لگ گئی ــ

کچھ سمجھ میں نہیں آتا لڑکی ذات کا کیا کیا جائے ـــــ وجہ ـــــ وجہ وہ جانتی تھیں لیکن کیا کرتیں۔ یوں دیکھو تو دنیا بھری پڑی ہے مردوں سے لیکن جو ڈھونڈنے پر آؤ تو ڈھنگ کا مرد ہی نہیں ملتا۔ دیکھتے بھالتے تو کوئی مکھی نہیں نکلتا وہ تو نانی جان پاکستان کو دولہا بھرا کھجور کا درخت سمجھ بیٹھی تھیں۔ وہاں سے آتے ہی جہاں کئی ایک کو مکان اور کوٹھیاں مل گئے تھے وہاں ایسی ایسی لڑکیوں کو ٹپ ٹپ ایسے شوہر بھی میسر آ گئے تھے۔ افراتفری کا دور تھا۔ چھین جھپٹ لگی تھی جو جو جس جس کے ہاتھ آ گیا۔ اب یہ تو اپنا اپنا دامن نانی جان نے جو قسمت کی پٹاری میں ہاتھ ڈالا تو تازہ کھجور کے بجائے گٹھلی ہاتھ لگ گئی۔ نانی جان نے جس لڑکے کے ساتھ یاسمین کا رشتہ طے کیا تھا اسے دیکھا بھی اور مطمئن ہو گئیں۔ لیکن تفصیلات تو بعد میں معلوم ہوئیں نانی جان جب منگنی کے بعد ان کے گھر میں داخل ہوئیں تو وہ مرغا بنے کھڑے تھے اور پیٹھ پر اپلوں بھرا ٹوکرا رکھا تھا۔ بچے کھڑے ہنس رہے تھے۔ پہلے تو وہ یہی سمجھیں کہ کوئی اور ہے لیکن جب وہ خود سلام کر کے اندر بھاگے اور اپلے پہیوں کی طرح رڑھتے سارے صحن میں پھیل گئے تو وہ دم بخود رہ گئیں۔

"بھائی جان سب کے حصے کی کھیر چاٹ گئے تھے۔ ابا جان نے ان کو سزا دی۔" ایک ننھی بچی آگے بڑھی اور بولی۔

"چل شیطان کی خالہ میرا شمیم سدا سے شریر ہے۔ جان بوجھ کر ایسی حرکتیں ہنسانے کے لئے کرتا رہتا ہے۔" ماں نے مسکراتے ہوئے بڑی خوب صورتی سے بات بنائی اور نانی جان کو مارے صدمے کے بات ماننا پڑی۔

امی جان ان دنوں باہر گئی ہوئی تھیں۔ یاسمین باہر لان میں بیٹھی چاول بین رہی تھی۔ اسے ہری ٹھنڈی گھاس میں ننگے پیر چلنا بڑا بھلا لگتا تھا وہ بار بار گھاس میں

انگلیاں پھنسا لیتی اور کچھ دیر کے بعد نئے سرے سے دوسری جگہ انگلیاں پھنسانے لگتی۔ اس لاشعوری عمل میں اسے بے حد طمانیت کا احساس ہو رہا تھا کہ ابا جان کے کمرے میں شدید شور و غل مچا وہ نہ صرف ڈانٹ رہے تھے بلکہ کسی کی پٹائی بھی کر رہے تھے۔ شکو اور زرینہ کھڑکیوں سے چپٹے کھڑے تھے۔ اس کا دل پھٹ پھٹے کی طرح بجنے لگا رات جب شمیم کمرے میں داخل ہوا تو اس کی آنکھیں سرخ تھیں اور پیشانی پر بڑا زخم تھا وہ اس کے قریب آ کر خاموشی سے بیٹھ گیا۔ اور یاسمین کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بولا۔ "کیا میں تمہیں بھی اچھا نہیں لگتا؟" "اور تو کسی کو نہیں لگتا۔" اس کی نگاہوں اور انداز تکلم میں پیشانی سے کہیں زیادہ گہرے زخم تھے۔ وہ آنسوؤں میں ڈوبی آنکھوں کو چھپانے کے لئے منہ پھیر کر سسک پڑا۔

"نہیں شمیم نہیں بالکل نہیں۔ تم تم تو مجھے اچھے لگتے ہو بہت اچھے بے حد اچھے۔" یاسمین نے اپنا سر شمیم کی گود میں ڈال دیا۔

دنیا بھی کتنی عجیب جگہ ہے نا ہر چیز کتنی مختلف طرح کی ہے دکھ خوشیاں دکھ پھر دکھ اور خوشی تک پہنچنے کے لئے بے شمار دکھ ابا جان کس دکھ کا بدلہ لے رہے ہیں۔ وہ بھی شمیم سے کیوں کیا غم و غصہ کا طوفان کبھی نہیں ٹوٹتا۔ کل شام ہی کیسی چونکا دینے والی باتیں معلوم ہوئی تھیں۔ نیلے بنگلے والی رحمانی بیگم بیٹھی اس گھر کی کتنی باتیں بتا رہی تھی جو شمیم کو بھی شاید معلوم نہ ہوں۔ یاسمین ابھی پہلی بہت سی باتیں ہضم نہ کر پائی تھی اور نئے قسم کے زبردست انکشافات اس کا رہا سکون بھی برباد کئے دیتے تھے۔ لیکن اس حساب سے تو امی جان کتنی مظلوم تھیں عورت تو اب بھی جائیداد ہے بے جان چونے پتھر کی چار دیواری جس طرح چاہو استعمال کر لو۔ دراصل امی جان کو چاہنے والے دو تھے۔ بیک وقت دو کی چاہت محض امی جان کی اچھی شکل ہی نہ تھی بلکہ اس میں کئی اور باتیں بھی شامل ہو گئیں تھیں جنہیں وہ خود بھی

چاہتی تھیں۔ وہ شہادت حسین تھے۔ انہی سے ان کی شادی کر دی گئی۔ یوں ان کے والدین اتنے بےبس نکلے۔ اس خوشگوار حادثہ میں شمیم کا نزول ہوا لیکن ابا جان چونکہ چچا زاد بھائی بھی تھے ان کا غصہ کسی طرح بھی ٹھنڈا نہ ہو پاتا تھا۔ انہوں نے شہادت حسین کو اس قدر تنگ کیا کہ انہیں ہتھیار ڈالنے پڑے یوں ابا جان نے امی جان پر قبضہ کر لیا اور مالِ غنیمت میں شمیم ہاتھ آئے جو تختہ مشق کی حیثیت سے استعمال ہوتے رہے جس پر غصہ اور نفرت کا نشانہ درست کیا جاتا رہا۔

نور رحمانی بیگم آپ بھی امی جان اور نانی جان کی طرح سمجھتی ہیں کہ شمیم کو بیحد ہمدردیوں کی ضرورت ہے — اور میں۔ مجھے بھی تو ایک مضبوط سہارے کی ضرورت ہے — اس نے بے حد دکھ سے اس وقت سوچا تھا — اور اب واقعی شمیم کو بے حد ہمدردیوں کی ضرورت ہے — کمرے میں نیلے بلب کی روشنی کا سحر طاری تھا اور وہ اب تک جاگ رہی تھی پاس ہی شمیم کروٹ میں لیٹا تھا۔ دونوں ہاتھ توبہ کی شکل میں چہرے کے نیچے رکھے تھے۔ اس انداز میں وہ ننھا سا بچہ لگ رہا تھا۔ اس نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور ہولے ہولے خراٹے لینے لگا۔ یاسمین نے ایک گہرا سانس لیا اور سونے کی کوشش کرنے لگی — ہماری اقدار کتنی مصنوعی اور کھوکھلی ہیں جیسے پتھروں سے صنم تراشی۔ رنگوں کے امتزاج۔ لکیروں کی آوازیں اور حرکات سے جذبات کی ترجمانی آرٹ کہلاتا ہے یہ ہماری حسن پرستی اور جمالیاتی ذوق کے اعلیٰ معیار ہیں لیکن کیا بھدی اور بگڑی شخصیت کو سنوارنا آرٹ نہیں — آرٹ قربانی چاہتا ہے۔ ماں آرٹسٹ ہوتی ہے۔ جو حیوانی خصائل بچہ کو ساری زندگی خوب صورت بنانے کی کوشش کرتی رہتی ہے۔ ہر عورت ایک بہت بڑی آرٹسٹ ہوتی ہے — میں بھی ایک آرٹسٹ ہوں، میں شمیم کو ایک قابل قدر انسان بناؤں گی۔

رات کتنی طویل ہوتی ہے۔ یاسمین نے اپنی تھکی انگلیوں کو مروڑتے ہوئے سوچا۔

"اٹھ جائیے میں نے آپ کے نہانے کے لئے گرم پانی رکھ دیا ہے۔" یاسمین نے اس کے پیر کے تلوؤں پر ہلکی سی انگلیاں پھیریں ــــ تو وہ آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے لگا۔ غسل خانے میں داخل ہوا تو ہر شئے کو سلیقہ سے موجود پایا۔ نہا کر باہر نکلا تو کپڑے پلنگ پر موجود تھے اور جو تیار ہو کر باہر نکلا تو ناشتہ تیار ملا۔ دفتر جانے کے لئے جوں ہی مڑا یاسمین نے بڑھ کر آنکھوں میں دیکھا۔ "شام واپسی میں شکو اور زرینہ کے لئے کوئی کھیلنے کی چیز لیتے آئیے گا ــــ اور ابا جان کے لئے سیب بھی "

"ابا جان ــ ان کے لئے میں زہر بھی نہ خرید لاؤں۔" اس نے نفرت سے منہ پھیر لیا۔ "میرے پاس پیسہ ہی نہیں ہے۔ خزانے کی چابی تو انہی کے ہاتھ میں ہے۔"

"پیسے ــــ اچھا مجھ سے لے لیں۔ آپ ہی نے تو دیئے تھے ــــ" یاسمین نے ہاتھ بڑھایا تو شمیم کو یوں لگا جیسے وہ خواب دیکھ رہا ہو اور یاسمین سے پہلی بار ملا ہو ــ اس کے چہرے پر خفیف سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ جب وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا باہر نکلا تو یاسمین نے دیکھا کہ وہ قدم جما جما کر رکھ رہا ہے۔

ان دنوں نانی جان، یاسمین کو مسرور دیکھ کر مطمئن سی ہو گئیں۔ وہ کچھ اور ہی سمجھ بیٹھی تھیں۔ یاسمین یہ محسوس کرتے ہی بدک گئی "ہائے توبہ کیجئے نانی جان۔ آپ نے مجھے اب تک نہ جانا۔ ایسی بات ہوتی تو میں رو رو کر اپنے آپ کو ہلکان نہ کر لیتی ــــ پہلے میں اس بچے کو تو پال لوں جو جس کے پلے آپ نے مجھے باندھا ہے۔"

نانی جان نے اسے دیکھا اور مسکرا کر خاموش ہو گئیں۔ یاسمین بدستور گنگنگ کرتی رہی ــ اون کا گولہ کرسی کے پائے میں شریر بچے کی طرح پھدکتا رہا۔ نانی جان نے دینی مسائل کی کتاب پڑھتے ہوئے کن انکھیوں سے دیکھا۔ "سوئٹر بنا رہی ہو۔ شمیم کا ہے۔"

"ہاں ــــ" وہ بڑے اعتماد سے بولی۔

"نانی جان یہ سن کر دوبارہ کتاب کی ورق گردانی کرنے لگی۔ رہو نہہ ــــ اتو

معاملہ سلجھنے کو ہے۔

"شمسہ بیگم (امی بھان) کب آ رہی ہیں؟"

"کل شام کو — اچھا میں اب چلتی ہوں۔" وہ اون اور سویٹر تھیلے میں ڈال کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"یہیں رہ جاؤ آج —" نانی بڑی نرمی سے بولیں۔

"نہیں نانی — اب مجھے نہ روکو — جس گاڑی میں مجھے سوار کیا ہے وہ مجھ ہی کو دوڑانا ہے۔ اس کا بالو ابھی ناتجربہ کار ہے۔"

یاسمین جب گھر میں داخل ہوئی تو شکو دودھ ابال رہا تھا۔ ابا جان بے حد چلّا رہے تھے کہ حقہ بھر کر نہیں رکھا گیا تھا اور کاغذات ادھر ادھر ہو گئے تھے۔ شمیم چلم اٹھائے تیزی سے باہر نکلا۔

"فضلو کہاں گیا — میں نے اسے کہا تھا کہ ابا جان کے آنے سے پہلے حقہ بنا کر رکھا کرے۔" یاسمین بولی۔

فضلو نے تو بنایا تھا۔ ابا جان نے آگ انڈیل دی کہ شمیم بنایا کرے اور وہ ہیں کہ دودھ ابالنے کو ہمیں کہہ گئے ہیں۔" شکو نے شکایتاً کہا۔

"شکو — اچھے بچے بڑوں کا نام نہیں لیتے اور شکایت بھی نہیں کرتے۔"

"ہم تو لیں گے۔ ہمیں اچھے ہی نہیں لگتے شمیم۔ سوتیلے بھیا ہیں ہمارے۔ ابا جان نے ہمیں بتا رکھا ہے —" وہ آنکھیں گھما کر بولا۔

"ہونہہ!" اس گھر میں یہ ادھوری تخلیق شاید ہی مکمل ہو — یاسمین نے بے دلی سے سوچا۔

"زرینہ کہاں ہے شکو؟"

وہ اپنی سہیلی کے ہاں گئی ہے۔ کہتی تھی سوتیلی بھابی خود ہی پکا لیں گی۔

مجھے تو بھوک نہیں ہے۔"

ہائے۔ شکو اور زری تم بھی ـــــ

شمسہ بیگم جب واپس گھر آئیں تو چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ سامان کی نئی ترتیب اور صفائی کو بغور دیکھا۔ پھر شمیم سے متعلق پوچھا۔

"وہ کام سے ابھی واپس نہیں آئے۔" یاسمین نے بتایا۔

"میرا بچہ بہت کام کرنے لگا ہے اب۔"

دوسرے ہی دن جب شمیم کہہ رہا تھا۔ "اماں میں الگ رہنا چاہتا ہوں۔" تو امی جان کو اپنے کانوں پر یقین نہ آیا

"کیا مطلب؟" وہ حیرت سے بولیں۔

"مطلب؟" اس گھر میں ـــ یہاں ـــ اس باپ کے ساتھ نہیں رہ سکتا" وہ کتنی تیزی اور خود اعتمادی سے کہہ رہا تھا کہ شمسہ بیگم بھونچکا رہ گئیں۔ دلہن بڑی گھنی ہے۔ میرے جاتے ہی یہ حالت کر دی۔" وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئیں ـــــ

پھر بہت دنوں کے بعد ایک دن گرمیوں کی دلفریب صبح جب بادل گھر گھر آئے تھے تو شمیم اپنے معمول سے گھر میں گھر میں دفتر جانے کے لئے جلدی جلدی تیار ہو رہا تھا اور یاسمین باورچی خانے میں ناشتہ تیار کرنے میں مصروف تھی کہ شمیم تیزی سے باورچی خانے میں داخل ہوا اور یاسمین کے کان میں بولا۔

"میں آپ کو کیسا لگتا ہوں ـــ؟"

"بہت برے!" وہ زور سے ہنسی۔ دو مترنم قہقہے گونج اٹھے اور رم جھم پھوار پڑنے لگی۔

الفاظ۔ ۱۹۷۲ء

گھر

کیا وہ آسمان سے ٹپک پڑی تھی ؟ بارش کی اس ننھی بوند کی طرح جو چاہے تو پھول کی شاداب پنکھڑی پر ٹھہر جائے ـــــ پیاسی زمین میں جذب ہو جائے یا کیچڑ میں مل جائے ـــــ اسے کچھ معلوم نہ تھا۔ پیپل کے گھنے پیڑ تلے جو فٹ پاتھ کی کل چوڑائی اور سواریوں سے بہتی سڑک کا کچھ حصّہ بھی گھیرے ہوئے تھا۔ ٹیک لگائے کبھی کبھی سوچا تھا۔ اس فٹ پاتھ پر وہ کیسے آئی۔ اس کا گھر کون سا ہے ؟ ـــــ اسے صرف اتنا یاد تھا کہ اس کی طرح دو لڑکیاں اور بھی تھیں اور ایک بوڑھی عورت بھی جسے یہ ماں کہتے تھے۔ لیکن وہ ماں نہ جانے کیا ہوئی تھی ـــــ ممّی نے اپنے آم آلودہ ہاتھوں پر موٹی سی چمکیلی مکھّی پر دوسرا ہاتھ زن سے مارا۔ مکھّی تو اڑ گئی لیکن اس کی ہتھیلی چوٹ کی شدّت سے جلنے لگی۔ اس نے ابھی ٹھیلہ سے آم اٹھایا تھا۔ ٹھیلے والے نے اس کے پیچھے بھاگنے کی کوشش کی۔ لیکن ٹھیلہ چھوڑتا تو باقی آم بھی اٹھ جاتے۔ وہ انتہائی غلیظ گالی

تک کر مکی کو آم کھاتے دیکھتا رہا اور دوسری سمت ہو لیا۔ مکی نے مٹکے سے پانی لیا اور دوسرے فٹے پائنچے کے دوسرے کنارے پر ہاتھ دھونے لگی۔ ـــــ کچھ ہی مدت قبل دونوں لڑکیاں بھی ایک ٹولی کے ساتھ نقل مکانی کر چکی تھیں۔ اس جگہ رہتے ہوئے انہیں طویل عرصہ گزر گیا تھا اور اطراف کے لوگ و راہگیر کنجوس تو کیا خبیث ہو گئے تھے۔ جن کے ہاتھ جیبوں میں ٹھسے باہر ہی نہ نکلتے تھے اور نگاہوں سے بجائے ترحم کے تنفر جھلکتا تھا۔ لیکن مکی نے یہ جگہ چھوڑنے سے صاف انکار کر دیا۔ "میں نا ئیں جاؤں گی تمہارے سات۔" وہ ہاتھ چھڑا کر پرے ہو گئی۔

"ہاں مکی میں بھی۔" مانی ہتھیلی پر رکھی شکر چاٹتے ہوئے بولا۔

"میں بھی کیا؟ ـــــ نہیں جائے گا کیا۔"

"بالکل نہیں۔"

"بالکل ٹھیک ـــــ ہم تم یائیں رہیں گے ـــــ اس گلی کے کونے میں گھر بنائیں گے۔ میں نے بہت دنوں سے سوچ رکھا ہے۔"

"گھر؟ وہ انگلی ہونٹوں پر رکھے گول گول آنکھیں کھولے دیکھتا رہا۔

"ہاں ـــــ گھر ـــــ" وہ کھلکھلا کر ہنستے ہوئے گھوم گئی۔

"مکی! میں سوچتا ہوں ـــــ تو یہاں کیسے آئی" ـــــ وہ جیسے گہری سوچ سے چونکا۔

"جیسے تم مانی ـــــ" مکی اس کی آنکھوں میں جھانکا پھر کھلکھلا کر گھوم گئی۔

"پر مکی یہ گھر کیسے بنے گا؟" ایک کان میں چاندی کی بالی اور صرف میلی دھوتی میں مبہوت کھڑا وہ چھوٹا سا بچہ لگ رہا تھا اور اس کی ہم عمر لگتی ایک

سمجھدار عورت۔

"دیکھ یہ اتنا بڑا گھنیرا درخت کیسے اگا ——— تو پانی دیتا ہے یا کہ ہیں؟ ——— ایسے ہی جس نے ہم کو یہاں بھیجا ہے گھر بھی بنائے گا۔ جس کی گھنیری چھاؤں میں ہمارے بچے پل کر جوان ہوں گے۔" مکی اسے سمجھانے لگی۔

"بچے! ——— بچے کیسے؟ ——— " وہ انتہائی معصومیت سے مکی کو دیکھنے لگا۔ مکی اسے پریشان دیکھ کر ہنسی سے لوٹنے لگی۔ سامنے ہی ایک طرف جوتے سیتے ہوئے خان نے اسے دیکھا ساتھ ہی جوتے نبوانے والوں اور راہگیروں نے بھی۔

"دیکھا مانی! اسی لئے کہتی ہوں گھر بنائیں گے ———" اس نے کمسن مانی جس کی مسیں بھی ابھی نہیں بھیگی تھیں کلائی سے پکڑ کر مٹکے کے پاس لے گئی۔

"ہاتھ دھولے۔ تیرے حصے کا کھانا رکھا ہے۔"

"تو کھا چکی۔"

"ہاں مجھے جور کی بھوک لگ آئی تھی۔"

"سن مانی کل سویرے ہی اپنا سامان دہیں گلی میں رکھ دیں گے۔"

"اچھا ———" وہ ٹھرے بڑے نوالے نگلتا ہوا بے خیالی میں بولا۔ اس کے بعد وہ دونوں فٹ پاتھ سے کافی فاصلے پر کھڑے ہو گئے۔

شام ہوتے ہی مکی اپنی رنگ برنگی گدڑی بچھا کر دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی۔

خان موچی چمڑے کی کترنیں اور اوزار تھیلے میں ڈال کر جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ سامنے شربت بیچنے والے ٹھیلہ پر خوب بھیڑ تھی۔ آج گرمی زیادہ تھی۔ جب مکی اپنی ریزگاری گن چکی تو خود بھی شربت کا ایک گلاس پینے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی کہ سامنے ہی مانی آتا ہوا دکھائی دیا۔

مکی بیں بھی پیوں گا ــــــــ" وہ بڑھ کر اس کے ساتھ ہو لیا۔

"کتنے پیسے لایا ہے۔"

"ایک روپیہ اور دو چونیاں۔"

"بس ــــ بیں پانچ روپے لائی ہوں ــــ" وہ تنک کر بولی۔

رات سونے سے قبل مائی نے اپنے پیسے دھجی بیں لپیٹ کر پیٹ پر باندھے اور اوندھا لیٹ گیا۔ مکی نے روپے تھیلی بیں ڈال کر آزار بند کے ساتھ باندھ کر تھیلی شلوار کے اندر کر لی اور ساتھ ہی گدڑی پر لیٹ گئی۔

اندھیرے منہ مکی نے اٹھ کر مائی کو جھنجوڑا اور دونوں آہستگی سے اپنا سامان اٹھا کر گلی بیں آبیٹھے۔ دیوار کے ساتھ اس نے اپنا سامان جوڑ کر سلیقے سے لگا دیا ــــ صبح سامنے ورکشاپ کے کاریگروں نے ایک نظران کو دیکھا پھر اپنے کاموں بیں مصروف ہو گئے۔ لیکن اسی وقت پولیس والا آنکلا۔

"کیوں مائی ــــ ادھر کدھر ــــ یہ زمین تیرے میرے باپ کی نہیں ہے۔"

"تیرا میرا باپ ا ــــ" وہ کھلکھلا کر ہنسی "ہمارے یاں باپوں کی زمین ہوتی ہی نہیں ــــ خدا کی ہوتی ہے ــــ تم ہی رہتے ہو اپنے باپوں کی زمین پر ــــ"

"چل زیادہ باتیں نہ بنا۔" وہ لاٹھی سے بکس کو دھکیلنے لگا۔

"غریب کو تنگ نہ کر ــــ یہ لے۔" مکی نے آزار بند کھینچ کر تھیلی سے کچھ روپے نکال کر اس کی مٹھی بیں دبا دیئے۔

"بس ــــ بڑے حاتم کا کلیجہ ہے۔" وہ بدتمیزی سے ہنسا۔ "باقی پھر سہی ــــ"

"باقی ـــــ پھر ـــــ کیا؟ تو نقد تیرہ ادھار"، وہ کھڑا لاٹھی بکس پر بجاتا رہا۔

"کیوں ستاتے ہو غریبوں کو"، رکی نے دو روپے اور نکال کر دیئے۔ جیسے ہی پولیس والا ہٹا۔ مکی ایک سے ایک نکڑ ہی گالی بکتی رہی اور مانی پرے بیٹھا ہنستا رہا۔ "مجھ سے زیادہ تو تجھے گالیاں آتی ہیں مکی"؟"

"تمہیں آتا کیا ہے ـــــ میں نے تو تمہیں گالی دیتے کبھی نائیں سنا۔ نہ جانے کیسا مرد ہے؟ تم کو تو ڈھنگ سے بھیک مانگنا بھی نائیں آتا ـــــ تیرے سارے کام مجھ کو کرنے پڑتے ہیں۔"، مکی نے آخری گالی مانی کو دے ڈالی۔ وہ اچھل کر اس کی جانب بڑھا اور اسی لمحے دونوں ہنسی سے لوٹنے لگے۔

ایک گلی چھوڑ کر دوسری گلی کے نکڑ پر بہت بڑی عمارت تعمیر ہو رہی تھی۔ باریک سنہری ریت کا ڈھیر لگا تھا اور سیمنٹ کی لاتعداد بوریاں ایک دوسرے پر چڑھی بیٹھی تھیں۔ منحنی سے ٹھیکیدار کی نگرانی میں مزدور منٹوں میں اینٹوں پر اینٹیں جوڑتے جاتے تھے۔ مکی نے رات مانی سے سرگوشی کی تو اس نے ٹھٹھک کر سر ہلایا۔ رات جب گلی بالکل سنسان ہو گئی تو مکی مانی کا ہاتھ پکڑ کر اٹھی اور دونوں نے مل کر راتوں رات سیمنٹ کا بھدا سا فرش بچھا دیا۔ وہ تو اتفاق سے سیمنٹ کی آدھی بوری بھی ایک طرف پڑی مل گئی تھی ادھر چوکیدار خراٹے لے رہا تھا۔ اس کام کے بعد دونوں ذرا پیچھے ہٹ کر سو رہے۔ صبح ہی اندھیرے منہ اٹھ کر چلے جاتے اور رات دیر بس لوٹتے۔ بانی کا چھپڑ کاڈ کر کے ایک طرف سو رہتے۔ دو تین دنوں ہی میں فرش ٹھیک ہو گیا۔ اس نے پھر سے اپنی چیزوں کو سلیقہ سے رکھا اور چھت و چار دیواری کے لئے سوچنے لگی۔ پچھلی گلیوں میں خوبصورت

بنگلوں کی ایک قطار تھی اور آخر میں کھلی جگہ پہ تمام بنگلوں کا کچرا پھینکا جاتا تھا
مکی وہاں سے کئی بار گزری تھی۔ لیکن اسے کچرے کے وسیع ذخیرے کی افادیت کا خیال
نہ آیا تھا۔ اب گھر بنانے کے لئے اسے بہت سی چیزوں کی ضرورت تھی۔ مکی کو اچانک
یہ کچرے کا ڈھیر بہت بڑی نعمت محسوس ہوا۔ وہ روزانہ بھیک مانگنے کے بعد اسی
جگہ آنکلتی اور گھنٹوں اسے ٹٹولا کرتی۔ لکڑی کے کچھ ٹکڑے۔ کپڑے کی کترنیں۔
ٹاٹ۔ پھٹی بوریاں، زنگ آلود کنستر و ڈبے اور ان کے علاوہ کبھی کبھی سڑے فروٹ
کے چند دانے بھی ہاتھ آجاتے۔ مکی آہستہ آہستہ ان چیزوں کو جمع کرتی رہی۔
بارش کے دن قریب آرہے تھے اور مانی بہت کم ریزگاری لاتا تھا۔ لیکن گھر تو
جلدی بننا چاہیئے۔

ارے مانی ــــــ یہ تیرے سر پہ کھجی کی چٹائیاں کیسی ــــــ" مکی خوشی
سے خوشی اچھل پڑی۔ "ہاں ــــــ بارشیں ہونے والی ہیں نا ــــــ کچھ تو سہارا
ہو جائے گا۔" وہ چٹائیاں اتاریوں اکڑ کر کھڑا ہو گیا جیسے وزن اٹھانے کا ریکارڈ
توڑ کر طلائی تمغہ جیت لایا ہو۔

"یہ تو ایک ہی رات میں بہہ جائیں گی۔ پیسے خرچ کرنا تھے تو ٹین کی چھت
خریدی ہوتی۔"

"ٹین کی چھت؟ ــــــ" وہ ہنسا۔

"یہ تو مفت ملی ہیں۔ خریدی تھوڑا ہی ہیں۔ ایک سیٹھ بانٹ رہا تھا۔
میں بھی لے آیا۔"

"ارے لے تو صرف دو ہی لے آیا۔ کچھ روپ دوپ بدل کر دو
چار اور لے آتا۔"

"دوسرے فقیر شکایت جو کر دیتے۔"

"نرا بدھو رام نراش کیا ہے ـــــ سو طریقے ہوتے ہیں تجھے تو کچھ آتا ہی نہیں۔"

"جا تو پھر تو ہی لے آ۔"

"چل میں چلتی ہوں کدھر کو جانا ہے۔" دونوں تیز تیز قدم بڑھاتے پہنچ گئے۔ مکی ایک لمبی لائن سے لگ کر کھڑی اپنی باری کا انتظار کرنے لگی۔ مانی پرے کھڑا دیکھنے لگا۔ اپنی باری آتے ہی مکی نے ایسی معصوم صورت بنائی کہ مانی نے مکی کی ایسی شکل خواب میں بھی نہ دیکھی تھی۔ صرف دو چٹائیوں سے کیا ہوگا سخی داتا بانسوں کا سہارا بھی تو ہو"

"چپ کر چھوکری لینا ہے تو لے لے۔" کارندہ چٹائیاں بڑھاتے ہوئے بولا۔

"بھلے اس آدمی کو بھیج کر میری جگہ دیکھ لے۔ ننگی چھت تلے سوتے ہیں سب گواہ ہیں۔"

"پکڑ مائی ورنہ راستہ لے اپنا۔" کارندے نے چٹائیاں اس کے آگے ڈال دیں۔ اور اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

"نا ہیں سیٹھ مجھے تو بانس بھی دلا دے ـــــ یا روپلے دے دے میں خود خرید لوں گی۔"

وہ یہ کہتے ہوئے آگے بڑھی تو کارندے نے بری طرح ڈانٹ کر دھتکارا لیکن وہ پرواہ کئے بغیر سیٹھ کے پیروں پر گر پڑی اور زار زار رونے لگی۔ سیٹھ کو پاؤں چھڑانا مشکل ہو گیا۔

"کریمیا! دے ڈال۔ پیچھا چھڑا۔"

"سیٹھ جی پیچھا چھڑانا تو ویسے بھی میں جانتا ہوں ـــــ جیسے آپ حکم دیں۔"

"دے دے بیس روپے بس ان سب کو دینے کے لئے ہی تو ہیں دے

ڈال دس دس روپے کے دو نوٹ ـــــ دوسرے ہی لمحے وہ شیرنی کی طرح مانی کے آگے دوڑی جا رہی تھی۔

صبح ہی گرمیوں کی چمکتی دھوپ میں مکی نے مانی کا ہاتھ پکڑا اور ایک ہی سمت اسے لیے چلی گئی ـــــ ہاتھ تو چھوڑ دے۔" مانی چلّایا۔

"پر کیوں؟" مکی بدستور پکڑے پکڑے بولی۔

"یوں۔" مانی نے جھٹکے سے ہاتھ چھڑایا اور گردن کھجانے لگا۔

"کھانے کو تو مل ہی جاتا ہے۔ ان روپؤں سے بانس خرید لیتے ہیں۔ کچھ دنوں میں چھت ڈال لیں گے۔ دیواریں اور ایک دروازہ رہ جائے گا"

مکی فراٹے سے بولے جا رہی تھی۔ مانی بے وقوفوں کی طرح اسے گھورتا رہا

ایسے بھی کوئی گھر بنتا ہے؟ ـــــ گھونسلہ تو نہیں بنانا ہے۔"

"ہم سے تو پرندے ہی بھلے ہیں۔ انڈے دینے سے پہلے گھونسلا بنا لیتے ہیں۔

مانی تو ذرا ہمت کر ـــــ دیکھ کیا جلدی گھر بنتا ہے۔"

"تجھے گھر کی ایسی ضرورت کیوں ہے مکی؟"

"اندھا کہیں کا ـــــ دیکھتا نہیں۔" وہ کھکھلا کر ہنسی۔

"ہیں ـــــ کیا؟

"کل کو بچے کا باپ ہو جائے گا اور ـــــ"

"بچے کا باپ ہیں!"

مکی پرے ہٹ کر سمٹ کر چلنے لگی۔

گلی میں تاریکی تھی۔ سڑک پر اکلوتی سرکاری بتی جل رہی تھی۔ زندگی کے کچھ آثار تھے۔ کبھی کسی گاڑی یا سیٹی کی آواز سنائی دے جاتی تھی۔ رات گئے جب مانی آکر لیٹا

تو مکی خراٹے لے رہی تھی ـــــــــ "یہ دیکھو مانی بانس! ـــــــ دیکھا کتنے بانس ہیں مگر کہاں بہتے جا رہے ہیں ـــــــ لسـ ـــــ رے تڈیوں کی طرح چٹائیوں کا ڈھیر ہوا میں تیر رہا ہے۔ آؤ مانی آؤ ان بہتے بانسوں کو اکٹھا کر لو ہمارا گھر بن جائے گا۔" مکی کروٹ بدل لو ـــــ اوئے مکی"، مانی چلایا۔

"بانس چٹائیاں ـــــ لے لو نا مانی!"

"پاگل عورت"، مانی نے بڑبڑاتے ہوئے اسے دھکیل کر اپنی کروٹ بدل لی۔ اور اسی لمحے دونوں خراٹے لینے لگے۔

صبح مریل کتا جب بالکل مکی کے قریب آ کر بھونکا تو مکی کی آنکھ کھل گئی۔ ملگجا سا اجالا پھیلا تھا۔ دکانوں میں آمد و رفت شروع ہو گئی تھی۔

"مانی اٹھ ـــــــ اٹھ بھی جا"، مکی نے پوری قوت سے جھنجھوڑ ڈالا۔ "چار ماہ ہو گئے۔ ہم ویسے ہی ننگی چھت تلے سوتے ہیں۔ اٹھ نا۔ کہتا تھا تیرے ساتھ رہوں گا۔ اٹھ!" مکی نے اس کی ٹانگ کھینچی۔ وہ بڑبڑاتے ہوئے کروٹ بدل کر سو گیا۔ اس کی مونچھیں اور داڑھی بری طرح بڑھ آئی تھیں دھوتی کے کنارے اڑسے ہوئے تھے۔ قمیض کے چاک ادھڑے تھے ـــــــ مکی چپکے سے اٹھی اور مٹکے سے کٹورہ بھر پانی اس پر انڈیل دیا۔ مانی تڑپ کر اٹھا اور پانی سے نکلے گلوڑے کی طرح پانی جھٹکنے لگا۔ چیختا چلاتا، گالیاں بکتا سڑک کی جانب دوڑ گیا۔ مکی نے فرش صاف کیا۔ سرکاری نل سے پانی بھر لائی۔ گدڑی کی تہہ کر کے بکس پر رکھی اور گلی کے نکڑ پر ساگو سے گرم گرم جلیبیاں خرید لائی اور آہستہ آہستہ بیٹھی کھاتی رہی۔ آخری جلیبی منہ تک لے جاتے لے جاتے اچانک رک کر کاغذ میں لپیٹ کر رکھ دی۔ معمول کے مطابق بھیک کے لئے آس پاس چکر لگایا اور اسی کوڑے کچرے والی کھلی جگہ پر آ گئی۔ آج گلے سڑے فروٹ کا الگ سے ڈھیر لگا ہوا تھا۔

اس نے آدھ گلی نارنگیاں اور سیب الگ کر لئے پھر گتے اور لکڑی کے ٹکڑے
تلاش کرتی رہی۔۔ٹین کے چھوٹے ڈبے اور زنگ آلود کنستر نکال کر پتھر سے کوٹ
کر سیدھا کرتی رہی۔ سارا سامان اکٹھا کر کے واپس پہنچی تو مانی ابھی تک واپس
نہ ہوا تھا۔ اس نے سامان جما کر کونے میں رکھا۔ ہوٹل سے ڈبل روٹی میں شوربہ
ڈلوا لائی۔ کھانے کے بعد تمام دھجیاں نکال کر جوڑتی رہی ـــــ مانی نہیں
آئے گا۔ اس نے کاغذ میں لپٹی جلیبی کو دیکھا جو جوں کی توں بکس میں رکھی ہوئی
تھی ـــــ سامنے فلیٹ کی بتی بجھ گئی تو اس کا دل خوف سے دھڑکا۔ مکی کو
معلوم ہو گیا کہ بارہ بج چکے ہیں۔ وہ خاموشی سے اپنی گدڑی پر لیٹ گئی۔ ہمارے
باپوں نے تو چار پانچ بچوں کو جن کر چھوڑا تھا۔ یہ ابھی سے چھوڑ گیا ـــــ مکی
مایوسی و غصّہ سے ہونٹ کاٹتی سو گئی۔

صبح جب مکی کی آنکھ کھلی تو وہ دھوپ میں نہا رہی تھی اور مانی مٹکے
سے پانی پی رہا تھا۔ کیسے بڈھوں کی طرح پانی پی رہا ہے ـــــ واپس آکر بیٹھا
تو مکی نے دیکھا کہ اس کی آنکھیں لال انگارہ ہو رہی ہیں۔ "مانی کیا تم نشہ کر کے آئے
ہو۔" وہ یہ سن کر ہنسا اور سر ہلانے لگا۔ مکی نے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے جھنجھوڑنا
چاہا تو وہ بخار میں تپ رہا تھا ـــــ مکی نے وہی کاغذ میں لپٹی جلیبی اس کے
سامنے رکھی "تم یہ جلیبی کھاؤ اور میں کیبن سے چائے اور گولی لاتی ہوں۔"

مکی کی مارے حیرت کے انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ ایک چڑیا بڑی
دیدہ دلیری سے چوں چوں کرتی آئی اور اس کے سامنے سے ہی فروٹ کے ساتھ
گھاس پھوس اور فالتو کترنیں جو اس نے ابھی ابھی پھینکی تھیں لے اڑی اور سامنے
ہی بلڈنگ کے پچھلے حصہ سے نکلتے ہوئے گٹر کے پائپ میں اڑس دی اور اسی طرح

ساری کنزینس بھی اس میں جما دیں ـــــ اِیں ـــــ کیا خوب صورت ہے چڑیا کا گھر!" بھیک کے لئے تھوڑا سا چکر لگا کر وہ بے صبری سے اپنی اس کھلی بکھرے والی جگہ پر پہنچ گئی۔ کوڑہ کرکٹ ٹٹولتے اور ٹین کے چھوٹے چھوٹے ڈبے سیدھے کرتے کرتے گھنٹوں گزر گئے۔ اسی لمحے مہترانی نے بنگلوں سے جمع کئے ہوئے کوڑے کی تازہ ٹوکری اس کے سامنے انڈیل دی۔ تو وہ لپک کر آگے بڑھی۔ اس میں کوئی چیز چمکتی نظر آئی۔ مہترانی کے ہٹتے ہی اس نے نکال لی۔ یہ چاندی کا چھوٹا سا جھنجھنا تھا جس میں چمکتی گھنگھریاں جڑی تھیں۔ مکی نے دوپٹے کے پلّو میں باندھ لیا اور باقی سامان کو باندھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے دیکھا سامنے بنگلہ کا چوکیدار اس کی جانب آرہا تھا۔

" ادھر کام کرے گا بنگلہ میں ؟"

"کیسا کام ؟"

"ایسا کوئی ـــــ صفائی برتن۔"

"مشٹنڈی ہاتھ پھیلانا کوئی اچھی بات ہے۔ جوان جہان ہے کام کیا کر!"

اس کے کانوں میں بیک وقت بہت سی عورتیں چلائیں۔ مکیؔ کو تاؤ آگیا۔

" نا بابا ـــــ جا تو اپنا کام کر ـــــ کام ـــــ کام ہی تو کر رہی ہوں۔"

" غو ـــــ انکو اکھی دکھاتا ہے ـــــ ہمارا کچرا اور پھینکو!"

"کیوں پھینکوں ـــــ اپنی محنت سے جمع کیا ہے۔"

" امارے بنگلے کا کچرا ہے ـــــ پھینک دو ـــــ " وہ غرایا۔

" امارے بنگلے کا ہے تو لے اندر ہی رکھا کر ـــــ " مکی نے ساری گٹھری اس کے اوپر پھینک دی جس کے کھلنے سے انواع اقسام کوڑے کی بارش ہوگئی۔

چوکیدار نے دوڑ کر مکی کے بال پکڑ لیے۔ اس وقت دونوں گتھم گتھا تھے کہ راہگیروں نے بمشکل تمام دونوں کو الگ کیا۔ مکی زخمی شیرنی کی طرح واپس ہوئی اپنا بکس اٹھایا، پٹخا اور پھر اٹھا کر بولی۔

"مانی میں جارہی ہوں ـــــ اس سے پہلے کہ تو مجھے چھوڑ جائے میں تجھے چھوڑ کر جارہی ہوں۔"

"کدھر؟" وہ اٹھ کر بیٹھ گیا ـــــ اچھا جدھر میں گیا تھا۔" وہ ہنس کر لیٹ گیا۔

مکی اپنا بکس اٹھائے گلیوں گلیوں پھرتی رہی جو ہو کا عالم طاری ہو گیا تو اچانک اسے ایک خیال آیا۔ وہ صبح والی جگہ پر آئی۔ وہی چوکیدار پڑا خراٹے لے رہا تھا۔ مکی نے غلیظ گیلے کوڑے کرکٹ کو ٹوکری میں بھرا اور چوکیدار پہ انڈیل دوڑی دوڑی واپس آگئی۔

مانی اب تک جاگ رہا تھا ـــــ مکی نے ساری روئیداد سنائی۔ دونوں ہنستے رہے۔

زیر تعمیر بلند و بالا عمارت کے کچھ حصے مکمل ہو گئے تھے جہاں لوگ آکر رہنے لگے تھے۔ مکی بھیک مانگتے مانگتے اس عمارت میں جا نکلی۔ بچے کھیل رہے تھے اور عورتیں گھر کے کاموں میں مصروف تھیں۔ موزائیک کے چکنے فرش پر پیر رکھنے سے وہ بار بار پھسلی جارہی تھی ایک فلیٹ کے اندر جب وہ داخل ہوئی تو اچانک بولی۔ "آپا کام کے لئے عورت چاہیئے۔"

"ہاں ضرورت تو ہے ـــــ مگر تم کہاں سے آئی ہو۔ کام والی تو نہیں لگتیں۔ خاتون نے باورچی خانہ سے نکلتے ہوئے ایک نظر دیکھتے ہی تیزی سے کہا۔

"کیوں نہیں۔ جو کہو گی کام کر دوں گی۔"

"اچھا تو کل سویرے آجانا ــــــ" وہ اسی تیزی سے کہہ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

مکی دوسرے دن صبح ہی صبح کام کے لئے پہنچ گئی۔ وہ خاتون کسی اسکول میں پڑھاتی تھیں۔ اس کے دو بچے تھے جو صبح مکی کے پاس رہتے تھے۔ گھر کا بھی سوائے کھانا پکانے کے سارا کام کرنی تھی۔ شروع میں تو مکی کو بے حد گھبراہٹ ہوئی۔ تنخواہ اتنی کم تھی کہ اس سے کہیں زیادہ تو وہ بھیک مانگ کر جمع کر لیتی تھی لیکن اب وہ زیادہ چل پھر نہ سکتی تھی۔ پھر جلد ہی بچے اس سے گھل مل گئے اور پھر کہ ــــــ یہ گھر تھا۔ ایک خوب صورت گھر جس کی مضبوط چھت در و دیوار تھے۔ جس میں ایک مرد عورت بچوں کے ساتھ پُر سکون زندگی گزار رہے تھے۔

بادل گھر کر آئے تھے۔ سیاہ بدلیاں پھنکارتی بڑھتی چلی آرہی تھیں۔ مکی کی مالکن کل ہی بچوں کو لے کر اچانک پنجاب چلی گئی تھی۔ مکی اپنے بکس پر بیٹھی کمزور سے بانسوں پر دھری چند چٹائیوں کی چھت کو گھور رہی تھی جو مستقل ہوا سے ہل رہی تھی۔ وہ اٹھ کر گلی میں آس پاس دیکھنے لگی۔ سامنے ہی گٹر کے پائپ پر گیلری کے چھجے تلے چڑیا کا ایک مضبوط گھونسلہ بن چکا تھا۔ دبیز گھاس پھوس میں دبی چڑیا کی صرف گردن نظر آرہی تھی۔

"بارش آنے والی ہے۔" مانی قریب آکر بولا۔

"مانی تجھ سے پکھیرو ہی بھلے ہیں ــــــ" وہ اسے گھونسلا دکھاتے ہوئے بولی۔

"چھت توڑ ڈال دی ہے اور کیا کروں؟ ــــــ" وہ کٹورے میں

جھانکتے ہوئے بولا۔

"چھت ڈالی ہے ۔۔۔۔۔ ابھی سے میری قبر بنانے کا کیا فائدہ!" مانی کٹورے میں پڑی کھیر کو چاٹنے لگا پھر بولا: "میں ڈھونڈ آیا ہوں جگہ ۔۔ بارش کے لئے۔ فسٹ کلاس علاقہ ہے۔ ایک خوبصورت دکان کے آگے پھیلا ہوا چھجہ ہے۔۔۔۔۔ وہیں مل بیٹھیں گے۔ نظارہ بھی کریں گے اور سوئیں گے بھی ۔۔۔۔۔" مانی کٹورہ زبان سے چاٹنے لگا۔ مکی نے زور سے مکا لگا کر کٹورہ پرے پھینک دیا پھر کندھے پر جھول کر انتہائی نرمی سے کہنے لگی۔ مانی تیرا دل نہیں چاہتا کہ ہمارا اپنا گھر ہو ۔۔۔۔۔ الگ ۔۔۔۔۔ اس میں ہمارے بچے سکھ اور چین سے رہیں ۔۔۔۔۔ چل آ ۔۔۔۔۔ تو اور میں ۔۔۔۔۔ میں اور تو مل کر ابھی ابھی اپنا گھر بنائیں ۔۔۔۔۔" وہ بے وقوفوں کی طرح اسے گھورتا ہوا اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ اسی عمارت میں جہاں مکی نے کچھ عرصہ کام کیا تھا سیڑھیوں کے نیچے لے گئی اور ایک ڈھیر کی طرف اشارہ کیا: "دیکھ ۔۔۔۔۔ یہ سب میں نے اپنے گھر کے لئے جمع کیا ہے۔ آ، اٹھا کر لے چلیں اور بارش ہونے سے پہلے پہلے اپنا گھر بنا لیں۔" یہ ڈھیر گتے اور لکڑی کے کئی چھوٹے بڑے ٹکڑوں، بوریوں، اینٹوں کنستر اور ڈبوں کے سیدھے کئے ہوئے ٹین پر مشتمل تھا۔ چند پھیروں میں دونوں نے پورا انبار منتقل کر دیا ۔۔۔۔۔ ہوا کے تیز ٹھنڈے جھونکوں سے بدلیاں پھیلتی جا رہی تھیں۔ محلے کے لڑکے لنگوٹیاں باندھے باہر نکل آئے تھے۔ راہ گیر تیز تیز قدم بڑھاتے گھروں کی جانب رواں تھے۔ جب سارا سامان منتقل ہو گیا تو مانی پچھلی دیوار پر چڑھ کر چھت پر گتے اور ٹین کے ٹکڑے بچھانے لگا اور مکی اینٹوں پر کھڑے ہوئے اسے گتے اور ٹین کے ٹکڑے پکڑاتی جا رہی تھی۔ موسم کی اچانک تبدیلی۔ لڑکوں کے شور سے مانی کام کرتے میں جھوم جھوم کر گانے لگا۔ مکی مسکرانے

لگی۔ لڑکے اور راہ گیر مڑ مڑ کر دیکھتے اور گزر جاتے۔ اس گلی کے جمعدار اور ورکشاپ میں کام کرنے والے کاریگر نے جاتے جاتے مکی کو ٹکٹکی لگا کر دیکھا اور پھر مانی کے قریب چلے آئے۔ عورت کو بٹھا دے بھائی۔ ہم کرتے ہیں کچھ کام تمہارا۔ وہ دونوں مانی کے ساتھ کام میں لگ گئے اور مکی بیٹھ کر سُتلی سے بوریوں کے ٹکڑے جوڑنے لگی۔ " بھائی ——— تمہاری بی بی تو بہت سگھڑ ہے۔ " جمعدار بولا۔

" ہاں ——— اسی لئے تو مصیبت میں پھنسا ہوا ہوں ——— ہر وقت گھر ——— گھر کی رٹ لگائے رہتی ہے ——— ساری زمین خدا کی ہے اور ساری زمین ہمارا گھر ہے۔ ہم فقیروں کا تو یہی مسلک رہا ہے ——— "

جب چھت مکمل ہو گئی تو جمعدار بولا۔ پلاسٹک کی شیٹ میں لے آتا ہوں۔ میرے پاس یونہی پڑی ہوئی ہے۔" رسی اور دروازے کی جگہ لکڑی کا تختہ میں لے کر آتا ہوں۔ ورکشاپ میں یونہی رکھا ہے۔" وہ دونوں دوڑ کر لے آئے۔ ہلکی ہلکی بوندا باندی ہونے لگی۔ مانی زور زور سے گانے لگا۔ پھر وہ دونوں بھی اس کے ساتھ گانے میں شریک ہو گئے۔ وہ تینوں نہ جانے کیا گا رہے تھے۔ مکی کی کچھ سمجھ میں نہ آ رہا تھا۔ خوشی سے اس کا سینہ پھٹا جا رہا تھا ——— وہ کتنی خوش تھی ——— اس قدر خوش کہ اس کا سانس پھولنے لگا۔ گنگنانے کی کوشش کرتی تو غوطے کھانے لگتی اور خاموش ہو جانا پڑتا۔ بوریاں سیتے میں اس کے ہاتھ کانپنے لگے۔ کبھی اوپر ان تینوں کو دیکھنے لگتی، کبھی آسمان اور کبھی سلتی بوریوں کو ——— شام ہو گئی تھی۔ اب بوندا باندی بھی ختم ہو گئی تھی۔ آسمان پر شفق پھوٹ رہی تھی۔ آہستہ آہستہ اندھیرا بڑھنے لگا تو وہ دونوں چلے گئے۔ دونوں دیواریں بھی بن گئی تھیں۔ کچھ بوری کا ٹکڑا پھر بھی بچ رہا تھا۔ مانی نے لڑکھڑاتے ہوئے تختہ

کو دروازے کی طرف آگے رکھ دیا اور لیٹتے ہی سو گیا ــــــ مکی دیر تک جاگتی رہی۔ بار بار چاروں طرف دیکھتی رہی۔

مکی نے اپنے بچے کو کپڑے میں لپیٹ کر تھیلہ کی طرح پیچھے کندھے پر لٹکا لیا اور فروٹ مارکیٹ کے پچھواڑے چل پڑی۔ مکی اب بھی شہر کے مختلف علاقوں، خوبصورت عمارتوں، پھل، ترکاری اور گوشت کی مارکیٹوں کے عقب میں جایا کرتی تھی۔ انہی کے پیچھے تاریکیوں اور گندگیوں میں سے کئی انمول چیزوں کو تلاشتی پھرتی۔ آج سڑے پھلوں کی لباندتری سی طرح پھیل رہی تھی۔ مکی نے لکڑی کی ایک خالی پیٹی میں چند سڑے پھل اور ترکاری بھرلی۔ اور جلد ہی واپس چلی آئی۔ مانی اپنی بڑھی ہوئی داڑھی کھجاتے ہوئے بولا۔

پھر کچرے سے گھر بھرنے لگی ہے تو!

اسی کچرے سے پل کر تو اتنا بڑا ہوا ہے تو۔،، مکی نے پیٹی اس کے سامنے رکھ دی۔

"سیب اور آڑو ہیں پہلے کھالے اور پھر ــــــ،، وہ کیل اور پتھر اٹھا لائی۔ اس پیٹی کی لکڑی سے ایک چوکی بنا دے۔ بچے کو سلانے اور نہلانے کے کام آئے گی۔"

رات خوب بارش ہوئی تھی لیکن فرش اونچا ہونے کی وجہ سے پانی نہیں آیا۔ اور چھت کا بھی صرف ایک کونا بہتا رہا تھا۔ ایک ہی چارپائی پر وہ چاروں پڑے رہے تھے۔ اس چارپائی کا چوتھا حصہ دارٹنی بھی اس دنیا میں آگیا تھا۔ مانی اونگھتے میں ذرا سی جگہ پاتے ہی سو گیا تھا۔ لیکن بالی، مکی کی ٹانگ سے چمٹا رہا اور ٹنی اس کی گود میں پڑا رہا ــــــ صبح ہوتے ہی اجلی اجلی

دھوپ چاروں طرف پھیل گئی ـــــ مانی ہوٹل سے چائے اور ڈبل روٹی لے آیا مکی نے ٹنی کو دودھ پلا کر کپڑے میں لپیٹ کر تکیہ بنا دیا اور چارپائی پر ڈالتے ہوئے بالی کو دھیان رکھنے کے لئے کہا۔ اور دونوں مکی اور مانی نے اپنی اپنی راہ لی۔

مکی کا گھر ابھی پوری طرح مکمل نہ ہوا تھا۔ سامنے دروازے کی جگہ وہی تخت رکھا تھا جس کو کھسکا کر آگے پیچھے کر دیا جاتا لیکن موقع ملتے ہی گلی کے کتے اور بلی اندر آجاتے تھے۔ ایک چارپائی رکھی تھی۔ ایک چوکی اور تین چار گدڑیاں دو بکس اور دیواروں پر جا بجا فلمی تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ جو بیک وقت کئی ضروریات پوری کرتی تھیں۔ دیواروں کی پھٹی پوری اور بے شمار درزوں کو چھپاتی تھیں۔ گھر کی خوبصورتی میں بے پناہ اضافہ اور بچوں کو بہلانے کا باعث بھی تھیں۔ لیکن بارش کی وجہ سے تمام حسین ہنستی مسکراتی اداکارائیں کبڑی، روتی، لیسورتی، ممینگی اور بدہیئت مخلوق میں تبدیل ہو چکی تھیں جن سے اب بچوں کو ڈرانے کا کام لیا جا سکتا تھا۔ مکی جب دوپہر کو واپس لوٹی تو ٹنی رو رو کر ہلکان ہوا جا رہا تھا۔ بالی کبھی اس کے منہ میں پانی ٹپکاتا اور کبھی اپنی انگلی ڈالتا تھا۔ بلی ایک طرف بیٹھی میاؤں میاؤں کر رہی تھی۔ مکی نے چند ٹوٹے پھوٹے کھلونے، چنے اور مونگ پھلی بالی کے آگے ڈال دیئے۔ ٹنی کو چپ کرا کے ہوٹل سے ڈبل روٹی میں شوربہ ڈلوا لائی۔ بالی جب کھا چکا تو مکی نے چند سڑے فروٹ کے دلنے اور ترکاریاں چنگیری میں ڈال کر دیں اور باہر جا کر بیچنے کے لئے کہا۔ بالی باہر بیٹھا فروٹ خود کھاتا رہا اور ترکاری پھینک کر اندر آ گیا۔ مانی نے دور سے دیکھتے ہی گالی بکی اور اندر داخل ہوتے ہی اسے پیٹنے لگا۔ مکی نے دیکھا۔ اس کی آنکھیں

لال انگارہ ہیں اور ہونٹوں پر جھاگ ہے۔ وہ تین دنوں کے بعد آج واپس لوٹا تھا۔ وہ بھوکی شیرنی کی طرح آگے بڑھی اور زناٹے کے تھپڑ مانی کو لگانے چاہے کہ اس کے اٹھے ہوئے ہاتھ بے جان ہو کر گر پڑے۔ مکی نے اپنے ہاتھوں پہ دانت گاڑھ دیئے اور بالی کو لے کر ——— باہر نکل آئی۔ خود ایک طرف بیٹھ کر صدا لگانے لگی اور بالی ہر راہ گیر کی جانب ہاتھ پھیلا کے دوڑتا اور ٹانگوں سے لپٹ جاتا۔

"مانی اب ہمارا گھر بن ہی گیا ہے پر۔ ایک بڑی ضروری چیج (چیز) رہ گئی ہے ———"

وہ پرے بیٹھا کالی سے پنڈلیاں کھجاتا رہا اور کوئی جواب نہ دیا ———

"ہیں ——— مانی ہیں نے کبھی کھانا نائیں پکایا ——— وہ میری مالکہ کہتی تھی جس گھر میں بی بی خود کھانا نہ پکائے وہ گھر ہی نائیں ہے"

مانی بدستور خاموش بیٹھا رہا۔

"تم کل ہنڈیا لے آنا ہیں پکاؤں گی ——— تم کبھی کچھ نہیں لائے ـ"

مکی آگے بڑھ آئی۔

"کبھی کچھ نہیں لایا ——— تجھے جو لایا ہوں ———" وہ گالیاں بکنے لگا۔

"مانی تم نشہ کرنا چھوڑ دو ——— ہم کہاں سے کھائیں گے؟"

"تم عجیب عورت ہو ——— میں تمہارے ساتھ رہ نہیں سکتا ——— تم پہلے ہی کون سا مبر اکھاتی ہو۔"

"تو کیوں ایسا کہتا ہے تو ———" مکی نے آنکھیں نکالیں۔

"مرد آرام کے لئے جیتا ہے ــــــ تم تو فقیروں کے مسلک سے واقف ہو۔"
"تو بچوں کا باپ ہے ــــــ"
وہ مکی کو پرے دھکیلتا ہوا چلّایا ــــــ" باپ۔ باپ ــــــ نہیں
اپنے باپ سے واقف ہوں ــــــ نہ تم اپنے کسی باپ کو جانتی ہو۔ فقیروں
میں باپ اور گھر نہیں ہوتے۔" وہ بے تحاشا گالیاں بکنے لگا ــــــ" بتا
اب گالیاں کسے زیادہ آتی ہیں۔ مرد بن گیا ہوں یا نہیں۔" وہ مکی کو دھمو کے
لگا کر قہقہے لگانے لگا۔

تینوں بچے سو رہے تھے۔ چند کھلونے چوکی پر رکھے تھے۔ مانی آج
بہت خوش تھا۔ کافی دنوں سے اس نے پینا بند کر دی تھی۔ مکی آج کہیں
سے گوشت لائی تھی۔ مٹی کا چولھا اس نے رات خود بنایا تھا۔ اور بالن بھی
اکٹھا کر رکھا تھا۔ مانی بہت سی جلیبیاں نان اور کباب لایا تھا۔ تینوں بچوں
کو اٹھایا اور زبردستی کھلاتا رہا۔ مکی حیرانی سے تکتی رہی۔" مانی دیکھ!
یہ چولھا میں نے بنا لیا ہے۔ کل اس گھر میں پہلی مرتبہ کھانا پکاؤں گی۔"
"پھر یہ گھر بن جائے گا۔" مانی بولا اور دونوں ہنسنے لگے۔
میں نے بالن بھی جمع کر رکھا ہے ــــــ مانی تو نے مجھے ایک نتھ تک
نہیں پہنائی۔"
" فقیروں کی بی بیوں کے پاس خود اتنا ہوتا ہے کہ شوہروں کی نتھ کی
ضرورت نہیں ہوتی۔
"میرے پاس کیا ہے گھر جو بنایا ہے ــــــ خرچ نہیں ہوتا کیا؟"
" تیرے پاس ــــــ تیرے پاس بہت ہے۔ تجھے کسی چیز کی کمی نہیں۔

وہ شرارت سے مکی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرایا ـــــ اور مکی کے اندر کی عورت بالآخر دام میں آگئی ـــــ وہ خوشی سے پھولی نہ سماتی تھی۔

''ہاں بتا تو مکی کتنے جمع کئے ہیں تو نے ـــــ پھر میں بھی بتاؤں گا!''

مانی یہ کہہ کر پہلے ہی تہمد کی ڈاب کھولنے لگا تو مکی بکس کے نیچے رکھی ہوئی گدڑی اٹھا لائی۔ میں نے تو سارے نوٹ اسی میں سی دیئے ہیں نہ جانے کتنے ہوں گے۔''

وہ سب دیر تک ہنستے کھیلتے رہے۔ رات بہت گزر گئی تھی مکی کو نا معلوم کس وقت نیند آگئی ـــــ وہ گہری نیند سو رہی تھی . . . .

''مکی ـــــ مکی میں جا رہا ہوں ـــــ مجھے میرے ساتھی بلانے آئے ہیں۔'' مانی اس کے سرہانے کھڑا سر ہلا کر کہہ رہا تھا۔ باہر فقیروں کا ہلکا ہلکا شور تھا ـــــ میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ جا رہا ہوں۔ زندگی ہوئی تو شاید مل جائیں!'' مکی سمجھی کہ خواب دیکھ رہی ہے اس نے آنکھیں کھول کر چاروں طرف دیکھا پھر آنکھیں ملتی ہوئی اٹھ بیٹھی۔ مانی واقعی جا چکا تھا ہر طرف بار بار دیکھا پھر چارپائی ٹٹولتی رہی جیسے مانی نہ ہو وہ نتھ ہو جو مانی نے اسے خرید کر دی ہو ـــــ باہر نکل کر دیکھا تو سناٹا تھا۔ وہ دیر تک اپنے بکس پر بیٹھی ہر چیز کو گھورتی رہی۔ یہ گھر تھا اس کا اپنا گھر ـــــ لیکن ـــــ ایک بار پھر اٹھ کر باہر نکل آئی۔ پُر سحر اندھیرا مٹا جا رہا تھا۔ اجالے کی آمد آمد تھی۔ مکی نے اس اجالے کے ساتھ آخری سہارے کی ننھی کرن کو اپنے اندر بند کر لینا چاہا۔ اس نے بکس اٹھا کر نوٹوں سے سلی گدڑی کو دیکھنا چاہا ـــــ اور وہ گدڑی بھی غائب تھی۔

ستمبر ۱۹۷۲ء

کیسے کیسے لوگ

شادی کے گھر میں اس قدر سناٹا۔ چہ معنی وارد؟ مجھے یوں لگا جیسے میں گھر میں نہیں۔ پرنسپل آفس میں داخل ہوئی ہوں۔ شاہد چچا کی شادی کو بمشکل ہفتہ ہی تو گزرا ہے۔ یہ سنہری ڈوریاں و چھوٹے بڑے دھاریوں دار غبارے رنگ برنگے پھول بھی تو خاموشی سے مسکرا رہے ہیں۔ صبح تک اتنے مہمان تھے اور میرے کالج جاتے ہی ـــــــ میں سیدھی دلہن چچی کے کمرے کی جانب بڑھی۔ ان کے جہیز کی چیزیں بکھری پڑی تھیں کہ لگتا تھا "آناً فاناً" کوئی طوفان اٹھا تھا۔ اور امی بھلا وہ کیوں بتائیں گی۔ ان کے نزدیک شادی سے قبل ہر عمر کا مرد عورت نابالغ اور ناپختہ ذہن ہوتا ہے۔ اسے گھر کی سیاست میں قطعی عمل دخل نہ ہونا چاہیئے اچھا یونہی سہی۔ رات جب میں بستر پہ لیٹی تو امی کی کھسر پھسر نے مجھے متوجہ کر لیا۔ ـــــــ ایسے مواقع بھی کیسے جان لیوا ہوتے ہیں۔ کچھ کچھ سنائی دے رہا تھا ـــــــ ہم نے جیسی گزار لی سو گزار لی۔ پہ نئی آنے والی تو یہ کہنے سے رہی۔

وہ آچکی نہیں اور نہ جانے کیا کچھ غائب ہو گیا ـــــ کہتی تھی بھابی ہیں ــ نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے ـــــ اور آپ کی اماں بے حد ناراض ہیں۔ کہتی ہیں بند کا بند جہیز دے دیا۔ ہمیں کیا خبر اس میں سانپ ہے کہ بچھو! ـــــ اچھا اب ختم کرو۔ بچوں کو ان باتوں کا علم نہیں ہونا چاہیئے۔ ابا جان کی آواز آئی۔ میرے دائیں جانب کھڑکی سے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے بالوں میں گھس کر اڑاتے رہے تھے۔ قریب ہی انار کے سرخ پھول ننھے بلب کی طرح روشن تھے۔ لان میں آم اور جامن کے پتوں کی آواز سے لگتا تھا جیسے ننھے بچے تالیاں بجا رہے ہوں ہوا کی زوں ـــــ زوں اور چاند کی روشنی میں شاخوں کی حرکت سے انسانی قدموں کی چاپ اور سایوں کا گمان ہوتا تھا ـــــ لیکن ـــــ یہ گمان نہ تھا۔ صبح مجھے معلوم ہوا کہ چچا شاید رات ہی خود جا کر دلہن کو لے آئے تھے دادی جان کا مارے غصے کے برا حال تھا۔ ان کا بلڈ پریشر کافی ہائی ہو گیا تھا ـــــ دلہن کا چہرہ کمہلا گیا تھا۔ کیسی اداس اداس سی لگتی تھیں ـــــ جیسے تازہ گلابوں کو توڑ نگ جائے۔ وہ دادی جان کی بے حد خاطر مدارت کرتی رہیں۔ پر دادی جان غصہ میں ہی رہیں۔ چچی کہتی تھیں دلہن نے معافی بھی مانگ لی غلطی ایسی ہوگی ورنہ کون معافی مانگتا ہے لیکن دادی جان نے معاف نہیں کیا تھا ـــــ ادھر چچی جان اور امی کے تعلقات اور کھسر پھسر میں اضافہ ہوتا گیا اور پھر چند دنوں کے بعد دلہن چچی بھی آ گئیں اور یوں نکون میز کانفرنس میں پہروں گزر جاتے ـــــ کالج کے کام کے دوران میں انہیں چپکے چپکے باتیں کرتا دیکھتی رہتی لیکن شگوا اکثر وہیں بیچ میں جا کر بیٹھ جاتا۔ ہمیں اتنا تو معلوم تھا کہ عام طور پر موضوع بحث دادی جان ہوتا ہے۔

"میں جا کر بتاتا ہوں دادی اماں کو ـــــ یہ خواتین آپ کے خلاف محاذ

بنا رہی ہیں۔ شکوا کڑ جاتا۔

"و چل ہٹ تیرے مطلب کی بات نہیں ـــــ بڑوں میں گھس کر بیٹھ جاتا ہے۔" امی ناراض ہونے لگیں۔

"کیوں نہیں مطلب کی ـــــ صبح خان مجھے بتا رہا تھا کہ میں اس گھر میں کام نہیں کروں گا۔ دادی جان سالن میں پانی ڈال کر مجھے دیتی ہیں اور دو دن کی پرانی (باسی) روٹی مجھے دیتی ہیں۔ وہ تو اور بھی بہت کچھ کہہ رہا تھا۔ دلہن چچی ایک دم چونکیں۔ کیا کہہ رہا تھا؟ ساتھ ہی امی اور بڑی چچی بھی چونکنی سی ہو گئیں۔

"میں نہیں بتاتی۔" وہ قہقہہ لگا کر اچھلتا ہوا میرے قریب آ کر بیٹھ گیا۔ میں اب بلیک میل کروں گا ان کو ـــــ وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔

"جاسوسی کہانیاں پڑھ کر تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے ـــــ کیا بلیک میل کرو گے۔ اس قدر ہیرو نہ بنو۔ دادی جان پہ بلیک میلنگ، اسمگلنگ بنگلنگ اور کسی بھی انگ کا اثر نہ ہو گا۔"

"نہیں زمینی کامریڈ ـــــ دنیا بڑی بے ایمان ہے۔ مجھے تو یہ پتہ ہے اور بس ـــــ میں صاف صاف دادی کو بتا دوں گا ـــــ وہ کہتا ہوا دادی جان کے پاس دوڑ گیا ـــــ امی لپک کر آئیں۔

"مجھے بتا دے کیا کہتا ہے خان ـــــ اچھا ابا جان کو آنے دے وہی تیری خبر لیں گے۔ وہ خود کو بے بس پا کر وہیں رک گئیں۔

"دادی جان آپ کا ایک راز ہے میرے پاس۔ اگر آپ چاہتی ہیں کہ میرے پاس محفوظ رہے تو آپ کو اسکوٹر خرید کر دینا ہو گا۔" ـــــ

دادی جان اس وقت پالک چُن رہی تھیں۔ انہوں نے جواب دینا تو درکنار شکو کو نظریں اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ دادی جان کا آدھا دوپٹہ پیڑھی کے نیچے پھنسا ہوا تھا۔ قمیص میں دائیں طرف لگی ہوئی لمبی جیب انواع و اقسام اشیاء سے پُر بکری کے دودھ بھرے تھن کی طرح لٹک رہی تھی ــــــ شکو نے دوبارہ مدعا بیان کیا تو انہوں نے جھنجلا کر لٹکی جیب کو گود میں اٹھا لیا۔ پھر بولیں ــــــ تمہاری باتیں تو میرے پلے نہیں پڑتیں۔ مونچھ داڑھی اتر آئی ہے اور ڈھنگ کی بات ایک نہیں کرتے۔

"یہ تو محض شوقیہ ہے" ــــــ شکو نے ٹھوڑی پر ہاتھ پھیرا اور بولا۔ "آپ کو پتہ بھی ہے خان مجھے کیا بتا رہا تھا ــــــ"

خان کی ایسی تیسی ــــــ کچھ ہی بکتا پھرے ــــــ موانا مراد۔ میری نئی قمیص استری سے جلا ڈالی ــــــ"

دادی جان بڑی عجیب بات کہہ رہا تھا آپ سے متعلق ــــــ بدنامی کرتا پھرے گا۔" شکو اپنی بات پہ اڑا رہا۔

"شکو! تم سودا لا دو مجھے۔ خان نہیں لوٹا ابھی تک ــــــ امی نے بے چین ہو کر اوپر سے آواز دی اور جب وہ اسی لمحہ اوپر آ گیا تو امی کی جان میں جان آئی۔

"بتاتا کیوں نہیں خان کیا کہتا تھا؟ ــــــ مجھے بتا دے دادی سے کچھ نہ کہنا۔ گھر بھر میں ہنگامہ برپا ہو جائے گا ــــــ دلہن چچی کا حشر نہیں دیکھا۔

"ایں ــــــ کیسا ہنگامہ ــــــ اچھا ٹھیک ہے کسی کو نہیں بتاؤں گا۔ وہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔

شام کو گلدانوں کے لئے پھول چننے کے لئے میں باہر نکلی تو شکو بھی پتنگ لے کر آ گیا۔

"یہ کیا مشغلہ ہے تمہارا۔ اس سے بہتر کبوتر پال لو۔ کیسے خوب صورت لگتے ہیں ـــــــ" میں جھربیرا کے پھول ٹٹولنے لگی۔

"یہ کٹے کبوتر تو پہلے سے اتنے موجود ہیں گھر میں ـــــــ" وہ ڈور سلجھانے لگا۔

"سنو شکو! ـــــــ یہ تم نے آج کل گھر میں کیا سنسنی پھیلا رکھی ہے" ـــــــ میں نے اس کی گردن میں باہیں ڈال دیں اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں (یہ سیاسی پیار تھا) شکو بھیا کیا مجھے بھی نہ بتاؤ گے ـــــــ کیا راز ہے۔ کتنے ہی دنوں سے جاننے کے لئے میرے پیٹ میں کھد بد ہو رہی تھی۔"

"راز یہ ہے کہ کوئی بھی راز نہیں۔" وہ شرارت سے ہنسا۔ جب وہ ہنستا تھا تو کڑکڑاتی مرغی کی طرح اس کے حلق سے آواز نکلتی تھی ـــــــ "دھجی میں نے تو یونہی اڑائی تھی۔ خان تو ہفتہ بھر سے میرے ہاتھ ہی نہیں لگا۔"

"ہیں سچ ـــــــ چچی اور امّی کتنی گھبرا گئی تھیں ـــــــ میرے ہاتھ سے نازک ٹہنی گر پڑی۔

"ہاں ـــــــ بلکہ ان سب کی گھبراہٹ سے مجھے اب معلوم ہوا ہے کہ واقعی کوئی راز ہے۔ ورنہ ـــــــ دادی کو تو ہم یونہی تنگ کرتے ہیں ان کی باتوں پر ـــــــ اب دیکھو دودھ لیا ایک سیر اور رکھ دیا برتن سیدھا نل کے نیچے جس کے بن گئے چار سیر ـــــــ گوشت لیا آدھ پاؤ اور ترکاری ڈال دی دو سیر۔ چلو جی پچاس لوگوں کا کھانا تیار ـــــــ"

"توبہ کرو شکو ——— تم تو بڑے ہی نہیں رکھتے تمہارے ——

میں تمہاری بات کو ہمیشہ چار سے تقسیم کر کے جواب نکالتی ہوں۔

تم حساب میں کبھی تیز نہیں رہیں۔ ایسے غلط کام نہ کیا کرو۔ مستقبل کی فکر کرو۔" وہ چرخی پر ڈور لپیٹ کر پتنگ کو سنبھالتے ہوئے واپس مڑا۔

"میں تو اس وقت نازکا مریڈ کے پاس جا رہا ہوں۔ ذرا اسے ستاؤں گے۔"

"وہ تم سے کبھی نہیں ستے گی۔ یہ خوش فہمیاں رہنے دو۔"

"کیسے نہیں ستے گی۔ میں اس کی چیاؤں میاؤں گیلری میں گھس کر سیاہ بلی پینٹ کروں گا۔ ناز بلی سے بہت ڈرتی ہے/ اس نے بال بھی تو کٹوالئے ہیں۔ بوائش اسٹائل میں ——— میرا جی چاہتا ہے کہ اس کے سر پہ ہاتھ پھیرتا رہوں ——— پھر اچھل کر بولا۔ دادی کو دکھا کر ڈانٹ بلواؤں گا۔"

"کس منہ سے کہہ رہے ہو۔ یہ تم نے بھی تو جگہ جگہ بالوں کے گچھے چھوڑ رکھے ہیں ——— تم ان بیل باٹم فلموں کی بیک کومبنگ کروانے لگے ہو گیا۔ ہائے کس منہ سے کعبہ جاؤ گے غالب۔

"آپ غلط سلط اشعار نہ پڑھا کریں۔ چچا نے کہیں سن لیا تو سو دفعہ لکھوائیں گے ہر شعر" ——— وہ کہتا ہوا ہوائی (سائیکل کا نام) پہ سوار باہر نکل گیا۔

امتحان قریب تھے اور موسم انتہائی خوشگوار۔ ہوائیں چلتی تھیں مگر عجیب و غریب۔ گھاس بھی ہری ہری ہی نظر آتی تھی۔ پھول بھی کئی طرح کے مختلف رنگوں کے کھلے تھے لیکن سب ہی چیزیں مجسم سوزِ امتحان معلوم دیتی تھیں۔ پرندوں کی چہچہاہٹ میں بھی سوائے چیخ و پکار کے کچھ نہ تھا۔ میں کبیدہ خاطر مبتلائے رنج و غم امتحان کالج سے واپس گھر لوٹی ہی تھی کہ اوپر سے آواز آئی۔

معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ ہماری کلاسیکل دادی جان صاحبہ صاحبِ فراش ہو گئی ہیں۔" شکو نے نیم کے درخت پر سے جھولتے ہوئے اطلاع دی۔

"بڑی صحیح جگہ نظر آرہے ہو آج ——— اطوار کے لحاظ سے تمہارا قیام یہیں ہونا چاہیئے ——— کیا آج صاحبِ فراش کا جملہ بنانا سکھایا گیا ہے تمہیں ——— میں جواب دیتی ہوئی اپنے کمرے میں آ گئی اور شکو بھی نیم کی شاخیں لئے آ گیا۔ نیم کے پانی سے غرارے فرمائیں گی۔"

"آواز تو تمہاری پھٹا بانس ہو رہی ہے۔"

"یہ تو سمتھنگ نیچرل ہے۔ ——— امّی کچھ لمحہ پیشتر بتا رہی تھیں کہ دادی جان عارضۂ زکام میں مبتلا ہیں۔

"تو پھر ——— ہر چند کہ زکام عارضہ ہے، نہیں ہے۔"

"میں حیران ہوں امتحان کے خزاں رسیدہ موسم میں آپ اس قدر گل و گلزار کیونکر ہو رہی ہیں۔"

"کیوں تمہیں مجھ پہ پھول اُگے ہوئے نظر آرہے ہیں ———"

"سنو زیبی! ——— وہ میری بات کاٹ کر اچھلا اور کتابیں میرے ہاتھ سے لے کر سجھاتے ہوئے بولا ——— پرسوں جیدی کی دادی کا جب انتقال پُرملال ہوا نا! تو میں، جیدی اور گوگی اوپر چڑھ کر منظر انتقال پُرملال دیکھتے رہے۔ سب بھائیں بھائیں رو رہے تھے۔ جیدی کہنے لگا یار رونے کا ٹورنامنٹ ہو رہا ہے۔"

"ایں! ——— اتنے بدتمیز ہو تم لوگ" ——— میں نے چونک کر دیکھا۔

"تم لوگ ——— بنو نہیں اب۔"

دامن کو ذرا دیکھ ذرا بند قبا دیکھ۔ ہاں تو سنو جیدی کی پھوپھی زنانے
کی جھپ سے چارپائی پہ جھک جاتی تھیں۔ انہوں نے لاتعداد چھکے لگائے۔
اور اس کی چچی نے کئی ایک چوکے لگائے۔ جیدی تو زیرو پہ آؤٹ رہا۔
"تمہیں رننگ کمنٹری کس نے سنانے کو کہا ہے۔؟"
سنو تو کامریڈ ______ دنیا بڑی بے ایمان ہے۔ جیدی بتا رہا تھا
پھوپھی جان دادی جان کی زندگی میں تو ہر وقت ان سے لڑتی رہتی تھیں۔
اور اب اچھل اچھل کر رونے سے فائدہ اور چچی سب سے دادی کی برائیاں کرتی
رہتی تھیں۔ وہ اس وقت قوالی گا رہی تھیں۔ وہ سر لگاتی اور باقی عورتیں
تال دیتیں۔ اشعار کیا تھے مجھے یاد نہیں۔
نالائق بین کر رہی ہوں گی۔" میں نے اس کے سر پہ ڈھول بجائی۔
"تم انہیں نالائق کہہ رہی ہو ______ اس نے مصنوعی حیرت سے
آنکھیں پھیلائیں۔
"تم کو نالائق کہہ رہی ہوں ______ نالائق! ______ افسوس کی بات
ہے شکو تم ایسی باتوں کو بھی تفریح بنا لیتے ہو ______"
ہم موت کو تفریح نہیں بنا رہے ہیں۔ ہم تو اداکاری کو ایپری شیئیٹ کر رہے
ہیں۔ اداکاروں کی کمی کا رونا ہر جگہ رویا جاتا ہے۔ ایسے موقعوں پہ آکر دیکھیں
کیسا کیسا ٹیلنٹ موجود ہے ہمارے ہاں ______ وہ تھوڑی دیر خاموش رہا
پھر بولا۔
ہم تو سچ سچ بتا رہے ہیں۔ اپنی دادی جان کو دیکھو نا۔ ان کی کوئی
عزت نہیں کرتا ______ امی اور چچیاں سب ہی کانا پھوسی کرتی رہتی
ہیں ______ اگر اپنی دادی بھی وہ ہو گئیں تو ______"

"شکو تالا لگاؤ زبان کو۔"

آج کل تالے نہیں لگتے۔ لاک کا فیشن ہے۔ یہ کافی مہنگا ہوتا ہے اور ہر دروازے پر فٹ بھی نہیں آتا۔ وہ کہتا ہوا اچانک ہوائی پر غائب ہو گیا۔

سب ہی کہتے تھے کہ دادی جان سچ مچ کافی بیمار تھیں۔ تمام اہل خانہ ان کے کمرے میں جمع تھے۔ ان کے سرہانے دوائیوں کے ساتھ نیلے ڈھکن والی وہ ڈبیہ بھی رکھی تھی جس میں ریزگاری رہتی تھی۔ جمعہ کے جمعہ بچوں کو اسی ڈبیہ میں سے جیب خرچ ملتا تھا۔ ایک آنہ سے زیادہ انہوں نے کبھی دینا پسند نہ کیا۔ ذرا بڑے بچے کو اگر ایک آنہ دینا اچھا نہ لگا تو دو پان منگوا کر دے دیتیں۔ یہ ڈبیہ ہر وقت وہ اپنے پاس رکھتی تھیں۔ اس کی حیثیت بھی ان کی عینک اور مصنوعی دانتوں سے کم نہ تھی۔ چچا اس وقت دوائیوں کا پرچہ دیکھ رہے تھے۔ امّی اور چچی ان کے پیر دبا رہی تھیں۔ دلہن چچی ایک طرف خاموش بیٹھیں تھیں۔ شکو کتنا بد زبان ہے۔ اگر خدانخواستہ واقعی دادی جان چل بسیں تو کیا ہوگا ——— میرا دل دھڑکنے لگا ——— وہ خاموش لیٹی تھیں۔ لیکن دلہن چچی سے شاید اب تک ناراض تھیں۔ پتہ نہیں کیوں ——— اور سب بھی تو دادی جان سے ناراض رہتے ہیں ——— دادی جان کی دل سے عزت کیوں نہیں کرتے آخر ——— بعض دادیاں کتنی پر وقار ہوتی ہیں ———

مجھے فوراً حمیرا جی کی دادی کا خیال آ گیا جنہیں سب اماں جی کہتے تھے۔ کیسی شاندار خاتون ہیں۔ انہیں دیکھ کر خود بخود قریب آنے کو جی چاہتا ہے ——— ہلکے رنگوں یا سفید براق ڈھیلے ڈھالے لباس میں دوپٹہ کی ٹِکل مارے جب اٹھ کھڑی ہوتی ہیں تو آس پاس سب ہی کی نظریں اٹھ جاتی ہیں۔

شاہدہ، حمیرا اور پری اپنے ڈھلکے ہوئے دوپٹے درست کر لیتی ہیں اور بچے بڑی عجلت سے آگے بڑھ آتے ہیں۔ اماں جی میرا ہاتھ پکڑ لیجئے۔ اماں جب بیٹھی ہوں تو ملنے والوں سے گھری ہوتی ہیں۔ سب کی خیریت دریافت کر رہی ہیں۔ کسی کو زبانی مشورے دے رہی ہیں تو کسی کو عملی مدد کا وعدہ ہے۔ اور اگر لیٹی ہیں تو بچوں کو ایک اشارہ ہی کافی ہے۔ دوڑے ہوئے آکر اپنی جگہ سنبھال لیتے ہیں۔ ایک دایاں پیر دبا رہا ہے۔ دوسرا بایاں، تیسرا دایاں بازو تو چوتھا بایاں بازو۔ باقی رہا سر تو گڈو اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھ دھرے بیٹھا ہے۔ سب کو دو دو آنے ملنے کا وعدہ ہے۔ ساتھ ہی ساتھ کہانی بھی ہو رہی ہے۔ جیسے جیسے اماں جی کہانی سناتی جا رہی ہیں۔ ویسے بچے اداکاری کرتے جاتے ہیں۔ سب کے اشارے کنلٹے ہاتھوں کے ہلکے بھاری دباؤ اور پلنگ کی چرچراہٹ کا اماں جی پر کوئی اثر نہیں ہوتا بلکہ وہ محظوظ ہوتی ہیں اور کہانی سناتی رہتی ہیں ــــــ اپنی دادی کیوں ایسی نہیں ہیں ــــــ اگر انہیں چمکیلے کپڑوں اور کھانے کی چیزوں کا شوق ہے تو ــــــ وہ ہم سے پیار تو کرتی ہیں ــــــ لیکن امی اور چچیوں کے خفیہ اجلاس سمجھ میں نہیں آتے۔ پتہ نہیں کیا کھچڑی پکتی رہتی ہے ــــــ کیسی ہیں ــــــ نہ جانے کیسی ہیں ہماری دادی جان ــــــ

دادی جان کی طبیعت ابھی ابھی قدرے سنبھلی تھی۔ بڑی پھوپھی جان اور ان کے ساتھ نازنہ بھی آئی تھی۔ نازنہ نے دوپٹہ خوب اچھی طرح اوڑھ رکھا تھا ــــــ دادی جان نازنہ کو اس طرح دیکھ کر بہت خوش ہوئیں۔ بلا کر اس کی پیشانی چومی۔ پھر بولیں کتنے سلیقے دوپٹہ اوڑھ

رکھا ہے۔ آج کل تو لڑکیاں جو ایک فلیتہ لگایا کرتی تھیں۔ وہ بھی نہیں رہا۔ چہرے پر کیا نور کا جوبن ہے۔ شکو ہاں میں ہاں ملانے لگا۔ اسی نور سے تو میں کمرے تک پہنچا ہوں۔ ورنہ سارا گھر تاریکی میں ڈوبا ہوا ہے۔"

"تمہیں اپنی تقریر کے جملے رٹ گئے ہیں شکوا"۔ میں نے اسے ٹھوکا دیا۔

"ہش ——— بتی جلالینے۔" دادی کچھ نہ سمجھتے ہوئے بولیں۔

ان دنوں ناز پانچ وقت کی نماز مع چند تسبیحاں بعد از نماز کے عملِ مستقل سے گزر رہی ہیں۔ مزید براں ان کی الماریاں قبلہ رو تمام رسائل کتب ہائے مذہبی سے پڑ الینا دہ ہیں" وہ پھر بولا۔

"شکو تمہیں رجب علی سرور یاد ہو گیا ہے۔" مجھے بولنا پڑا۔ ان دنوں وہ فسانۂ عجائب پڑھ رہا تھا۔

"ہائیں ——— تم یہ بیٹھے بیٹھے کیسی زبان بولنے لگتے ہو ——— جاؤ میرے صندوق سے بہشتی زیور۔ ہدایت نامہ نیک بیبیاں اور کریما بہ بخشا نکال لاؤ ——— دادی جان قدرے بیٹھ کر بولیں اور شکو جیسے اس بات کا منتظر تھا۔ دوڑ کر ساری کتابیں لے آیا اور ناز کی گود میں ڈال دیں۔ وہ اب تک بڑی احتیاط سے دوپٹہ لپیٹے بیٹھی تھی۔ دادی جان اور زیادہ خوش نظر آ رہی تھیں۔ پھر اسی لمحے شکو نے اپنی پینٹ کی ہوئی سیاہ بلی ناز کی گود میں ڈال دی۔ وہ چیخ مار کر اچھلی۔ کتابیں فرش پر بکھر گئیں اور وہ خود سیدھی دادی جان کی گود میں جا گری۔ اس کا دوپٹہ بستر پہ تھا۔ دادی جان ناز کے کٹے ہوئے بالوں اور سیلولیس قمیض کو دیکھ کر بے ہوش ہوتے ہوتے بچیں۔

صبح جب میں اٹھی تو گھر میں سناٹا تھا۔ معلوم ہوا دادی جان کی طبیعت
رات زیادہ بگڑ گئی تھی اور انہیں بمشکل ہسپتال پہنچا دیا گیا تھا۔ خرابی کیسا
کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا تھا کہ ریزگاری والی ڈبیہ سامنے
میز پر ہی رکھی رہ گئی تھی ـــــــ وقت گزرنا محال ہو گیا تھا۔ میں اور ناز
لان میں بیٹھے تھے۔ شکو اندر تھا۔ ناز دادی جان کا اسکیچ بنا رہی تھیں۔
اور میں مونیا کی وہ کلیاں گن رہی تھی جو اس شام کھلنے والی تھیں کہ باہر
سے گاڑیوں کے دروازے کھلنے اور بند ہونے کا شور آیا۔ کئی طرح کی ملی جلی
آوازیں بھی ـــــــ دادی جان آ گئی تھیں ـــــــ لیکن زندہ نہیں
ـــــــ دوسرے ہی لمحہ گھر میں کہرام مچا تھا۔ بڑی پھوپھو پچھاڑیں کھا
رہی تھیں۔ چھوٹی پھوپھی ان دنوں باہر گئی ہوئی تھیں۔ ناز کے ناک کی تپ
لال ہو رہی تھی اور میں نے دیکھا ہر دم شرارت کرنے والا ـــــــ موت
پر بھی ہنسنے والا شکو ایک طرف کھڑا بلک بلک کر رو رہا تھا ـــــــ
ہائے شکو یہ تم ہو! ـــــــ کہتے ہیں ایسے موقع پر سب ہی کو دراصل اپنے
دکھ یاد آ جاتے ہیں اور یہ کہ روتوں کو دیکھ کر رو پڑنا اور ہنستوں کو دیکھ
کر ہنس پڑنا جبلی عمل ہے تو کیا یہ سب ہی فطری جذبوں اور ضرورتوں میں بندھے
ہوتے ہیں ـــــــ محبت نامی چیز پھر کیا ہوتی ہے ـــــــ کون جانے
یوں تو دادی جان کے انتقال کو ایک ہی ہفتہ گزرا تھا لیکن چھوٹی پھوپھی
جان تمام بچوں کو چھوڑ کر آئی تھیں۔ ان کے امتحان ہو رہے تھے اور انہیں جلدی
واپس جانا تھا ـــــــ سب نے چاہا کہ اماں جان کا سامان دیکھ لیا جائے
دادی جان کا وہ کمرہ کھول کر دیکھا گیا جس میں ہر وقت تالا لگا رہتا تھا۔
اور ہمیں کبھی دیکھنے کا خیال بھی نہ آیا تھا۔ ہم سب اشتیاق سے اندر داخل ہوئے تو کمرہ

جنرل اسٹور معلوم ہوا۔ اس میں انواع اقسام چیزیں تھیں۔ مارے حیرت کے میری اور شگو کی سٹی گم ہو گئی۔ ناز او گھوش او گھوش کہتی رہی ——— البتہ زیادہ حیرت اس بات کی ہوئی اور امّی اور چچی کو زیادہ حیرت نہ ہو رہی تھی بلکہ وہ چپکے چپکے مسکرا رہی تھیں۔ ——— دلہن چچی کے کچھ سمجھ میں نہ آ رہا تھا۔

دونوں چچیاں خاموش تھیں۔ کمرے میں سامنے ہی بکسوں کی ایک قطار تھی۔ ایک کونے میں کچھ برتن رکھے تھے۔ سامنے ٹوٹا پھوٹا فرنیچر رکھا تھا۔ دوسرے کونے میں بسکٹوں اور گھی کے ڈبے رکھے تھے۔ شگو نے جلدی جلدی بکس اتارنا شروع کر دیئے۔ سب ہی میں کچھ نہ کچھ تھا۔ ہمیں یوں لگا کہ جیسے اہرامِ مصر میں داخل ہو گئے ہوں۔ جہاں عظیم ممی کے ساتھ سارا سامان دفن ہے۔

اتنا سامان کیوں چھوڑ گئیں۔ شگو حیرت سے پوچھ رہا تھا اور وہاں کوئی جواب ہی نہ دیتا تھا۔ سب ہی کھسیانے کھسیانے چیزیں ٹٹول کر الگ کرتے جاتے تھے۔

"یہ جوڑا مجھے دیا تھا انہوں نے بڑی ہیں۔ یہ جوتے بھی۔ اب تو چھوٹے ہو گئے ہوں گے۔" امّی اٹھا کر دیکھنے لگیں۔

"یہ جگ گلاس اور دیگچیاں میری ہیں جو گزشتہ سال کھو گئی تھیں"۔ بڑی چچی بولیں۔

"یہ میرا دوپٹہ اور نئے چپل یہاں کیسے آ گئے ———"۔ میں دیکھتی ہی رہ گئی۔

"اوہو ——— کلرڈ پنسلیں اور میرا قلم یہاں رکھا ہے۔ یاد ہے زینی جب میں آٹھویں کلاس میں فرسٹ آیا تھا تو اباجان نے مجھے دیئے تھے۔

دلہن چچی جو دیر سے ایک طرف خاموش کھڑی تھیں آہستہ سے آگے بڑھیں

اور جالی کے رومال سے لپیٹے ہوئے جوڑوں کو اٹھا لیا۔

"ہاں یہی تو ہیں وہ جوڑے جن کے لئے شادی کے دوسرے ہی دن اتنا جھگڑا اٹھا تھا۔" انہوں نے جیسے ہی جوڑے اٹھائے ایک مخملی چپل گر کر نیچے گری۔ اور دو بروکیڈ کی بریزیئرز بھی الگ جا پڑیں۔

"او گوش! نانی کو اتنی شائننگ برا پسند آ گئیں۔" ناز نے انتہائی مغربی انداز میں اظہار حیرت کیا۔

بڑی پھوپھی نے زہر آلود نگاہوں سے ناز کو دیکھا۔ اور خاموشی سے باہر چلی گئیں۔ ان کے پیچھے پیچھے چھوٹی پھوپھی بھی باہر نکل گئیں۔

نیرنگ خیال ۷۲ء

بول کہ لب...

یہ سامنے جو لڑکا بیٹھا ہے نا ـــــ چپ چاپ دبلا پتلا سا۔ یہ میرا بھیا شامی ہے۔ اسے یہاں آئے ہوئے دو دن ہو گئے ہیں لیکن یہ اسی طرح خاموش بیٹھا ہے بولتا ہی نہیں۔ جس دن ہم نے سنا۔ وہ چاٹ گام سے نکل کر برما پہنچ گیا ہے تو ہم نے سکون کا سانس لیا تھا اور اس کے بعد طویل دن کچھ جلد ہی گزر گئے۔ جس دن وہ یہاں آنے والا تھا۔ میں نے اور ساجد نے پورا گھر سجایا تھا۔ ہم پھولوں کے ہار لے کر ائیر پورٹ پر شامی کے منتظر تھے کہ ایک باریش کمزور مرد بنیان اور لنگی میں سامنے آ کھڑا ہو گیا ـــــ پتہ چلا یہی میرا بھیا شامی ہے میں دو قدم پیچھے ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔ امی نے اس کی پیشانی چوم لی اور گلے لگایا۔ بابا نے سر پہ ہاتھ پھیرا اور پوچھا۔ "بیٹا کیسے ہو؟" ـــــ اس کمزور باریش مرد نے خشک ہونٹوں پہ زبان پھیری لیکن زبان ہونٹوں سے بھی زیادہ خشک تھی ـــــ گھر پہنچ کر جب تک کہ بھائی جان نے حجام کو بلوایا اور بھیا کے نہلانے کے لئے پانی گرم کروایا۔ میں اور ساجد

دوسرے کمرے میں روتے رہے۔ جب ہماری آواز باوجود ضبط کے بھی نہ رک سکی تو بھائی جان نے آکر کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔

منہ دھو کر میں باہر آئی تو دیکھا کہ امّی اور بابا کھانے کی میز پہ شامی کے منتظر تھے بھائی جان بھی آکر بیٹھ گئے۔ شامی ابھی نہا کر نکلا نہیں ؟" بابا نے بے چینی سے رسالہ ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔ "میں جا کر دیکھتا ہوں۔" بھائی جان اٹھ کھڑے ہوئے اور امی بھی ان کے پیچھے چل دیں۔ میرا دل وسوسوں میں گھر گیا۔ وہ اب تک نہا رہا تھا؟ ——

بھائی جان غسل خانے کی طرف بڑھے۔ "ارے شامی! تم یونہی بیٹھے ہو کپڑوں سمیت۔ بھئی نہا لو نا شاباش! ہم سب کھانے پہ تمہارا انتظار کر رہے ہیں" —— امی جان پہلی بار کانپتے ہاتھوں سے آنکھیں پونچھنے لگیں۔

بیٹا! کوئی بات کرو۔" بابا نے سالن شامی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا —— ہاں —— تو اتنے دن کیسے گذرے ؟"

" بس گذر گئے " —— یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا اور حیران حیران نظروں سے دیکھتا رہا۔ امی کے کہنے پہ دو نوالے لئے۔ پھر کہنے لگا۔

"میں نہیں کھا سکتا۔ میں تو کچے چاول کھاتا تھا۔" —— وہ ایک دم چپ ہو گیا۔ نہ جانے کیسے ہم نوالے لیتے رہے۔

" ہمیں کیا پتہ تھا شامی بھیا —— باہر ہوا میں مچلتے ہوئے پھول کتنے بھدے لگ رہے تھے۔ بادام کا درخت کیسا اداس کھڑا تھا۔ ہوائیں رو رہی تھیں اور نیلے پردے ہوا سے یوں تڑپ رہے تھے جیسے زخمی کبوتر دم توڑ رہے ہوں۔ باہر لان میں رشتہ داروں کا ہجوم تھا۔ لوگ اپنے عزیزوں کی خیریت دریافت کرنے کے لئے بے چین تھے۔ بھائی جان نے شامی بھیا کے واحد تھیلے سے چند خطوط نکال کر انہیں دے دیئے پھر شامی بھیا کو اٹھا کر بستر تک لے گئے —— شامی تم اب

اپنے گھر آگئے ہو۔ لو اطمینان سے سو جاؤ ـــــ تمہیں پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ۔" بھائی جان نے جیسے لٹا دیا وہ لیٹ گیا ـــــ ارے اتنا چنچل اور نٹ کھٹ بھیا۔ کیسے مٹی کا مادھو بن گیا تھا۔ اٹھا دیا تو اٹھ گیا۔ بٹھا دیا تو بیٹھ گیا اور لٹا دیا تو لیٹ گیا۔ مارے دکھ کے جی چاہتا تھا کہ چیخ چیخ کر رو پڑوں۔ امی جو اب تک ضبط کئے ہوئے تھیں پھوٹ پڑیں۔ بھائی جان ایک بار پھر ہم دونوں کو پکڑ کر دوسرے کمرے میں لے گئے اور سمجھانے لگے۔

یہاں بھی سب رو رہے ہیں۔ یہی تو میں کہتا ہوں کہ ساری دنیا رو رہی ہے"۔ شامی نے کہا۔ جیسے وہ گہری نیند سے جاگ رہا ہو۔

"نہیں تو شامی بھیا، ہم سب آپ کے آنے پر اتنے خوش ہیں۔ اتنے خوش" ماجد یوں ہنس رہا تھا جیسے منہ چڑا رہا ہو۔

لان میں دیر تک لوگ بابا کے پاس بیٹھے وہاں کی خیریت دریافت کرتے رہے خواتین بالکل خاموش تھیں۔ کچھ آہستہ آہستہ آنکھوں پہ دوپٹہ رکھے رو رہی تھیں۔ ایک بزرگ بلک بلک کر رو رہے تھے۔ وہ حج کر کے ادھر آگئے تھے اور ان کے سارے بچے وہیں تھے۔ ان کے آنسو سفید داڑھی سے گرتے ہوئے دامن میں جذب ہو رہے تھے۔ بڑھاپا اور اس عمر میں آنسوؤں کی ایسی روانی۔ اس عمر میں تو یوں بھی آنسو خشک ہو جاتے ہیں ـــــ ہم کیوں زندہ ہیں ـــــ آخر ہم پاگل کیوں نہیں ہو جاتے ـــــ سب کی آنکھوں میں آنسو ہیں۔ سب رو رہے ہیں ـــــ ساری دنیا رو رہی ہے۔ ساری قوم بلک رہی ہے ـــــ اے قوم تیرا کیا ہوگا ـــــ ؟ انسان ٹوٹ چکا ہے۔ آج کا انسان چند بڑی قوموں کی اجارہ داری ہے۔ اس دنیا میں کئی خدا پیدا ہو گئے ہیں ـــــ ہم ـــــ ہم سب کٹھ پتلیاں ہیں جن کی ڈوریاں چند بڑے ہاتھوں میں ہیں ـــــ دنیا کا نقشہ ان کی مرضی کے مطابق بنے گا ـــــ دیکھو شامی انسان

ٹوٹ گیا ہے ـــــ ہم سب ٹوٹ گئے ہیں اور شامی بھیا تم بھی ٹوٹ گئے ہو۔ اگر تم جڑ بھی گئے تو تم پہلے سے شامی نہیں رہو گے۔ تم کئی حصوں میں بٹے ہوئے ہو گے۔ تم اس ۶ ماہ کے عرصے میں ساٹھ سالہ بوڑھے دکھائی دینے لگے ہو ـــــ شامی تم کیونکر ایسے ہو گئے ـــــ ہائے شامی مجھے یاد ہے کہ سب کچھ اچھی طرح یاد ہے۔ تم لہک لہک کر اقبال کی نظم "ایک نوجوان کے نام" پڑھا کرتے تھے۔

تیرے صوفے ہیں فرنگی تیرے قالین ہیں ایرانی
لہو مجھ کو رلاتی ہے جوانوں کی تن آسانی

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے اس کو اپنی منزل آسمانوں میں

میں نے کہا تھا یہ نظم تو اس قدر گھس گئی ہے کہ آئندہ فرنیچر، قالین اور ادویات کے اشتہارات کے لئے اس کا استعمال ہوا کرے گا۔

خدا گنجے کو ناخن بھی تو نہیں دیتا ـــــ سنو ـــــ سنو ـــــ،

اس موج کے ماتم میں روتی ہے بھنور کی آنکھ
دریا سے اٹھی لیکن ساحل سے نہ ٹکرائی

پھر تم سینہ پہ ہاتھ مار کر کہتے تھے ؎

"کم کوش تو ہے لیکن کم ذوق نہیں شامی"

شامی تم تو اپنے شوق کے لئے گھر سے بھاگ جانے کی ٹھانے ہوئے تھے ۶۵ء کی جنگ میں بھرتی کے لئے چپکے سے ہو بھی آئے تھے لیکن انہوں نے کم عمر اور کمزور ہونے کی بنا پہ تمہیں رد کر دیا تھا۔ تم نئے سرے سے اپنی تعمیر میں لگ گئے پھر شامی جب تم نے مولانا محمد علی پہ رشید احمد صدیقی کا مضمون پڑھا تو بکھر گئے تھے۔ بار بار اسی اداس سا کن شہتوت کے درخت کے اطراف گھوم گھوم کر چند اقتباسات

دہرائے جاتے تھے۔ جوشیلی ہوائیں چیختی چلاتی گزرتی رہتیں اور تم بلند آواز سے پڑھتے رہتے۔ ’’محمد علی کے باب میں بعض کہتے ہیں کہ وہ بڑے تھے لیکن ان کا کوئی کارنامہ نہیں ـــــ یہ تنگ دلوں اور تنگ نظروں کا فیصلہ ہے۔ مرد غازی کے کارناموں کا اندازہ مقبوضات کی وسعت۔ مالِ غنیمت کی فراوانی۔ جشن و جلوس کی ہماہمی، طرب انگیزی ـــــ سے نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس کا اندازہ کیا جاتا ہے۔ ٹوٹی ہوئی تلوار بکھری ہوئی زرہ۔ بہتے ہوئے لہو ـــــ دہکتے ہوئے چہرے، ڈوبتے ہوئے سورج سے۔ آخری سطریں پڑھتے وقت تمہارے چہرے پر کئی رنگ آتے جاتے تھے۔ تم کہتے ـــــ ’’بس دیکھو شمی بیگم میں عظیم شخصیت بننے جا رہا ہوں۔‘‘ کہنا پڑتا ـــــ کس فیکٹری میں ـــــ دو چار مجھے بھی بنوانی ہیں ـــــ میری بات سنی ان سنی کرتے ہوئے تم کہتے ـــــ کامل ہستی ـــــ نیٹشے کا سپرمین۔ اقبال کا مردِ مومن۔ ٹیپو سلطان کا دوسرا جنم

’’لو اپنی بات کو خود ہی رد کر ڈالا ـــــ مردِ مومن بننا چاہتے ہو اور دوسرے جنم کی بات کرتے ہو ـــــ‘‘

’’شاہین ـــــ اقبال کا شاہین۔‘‘

’’گرجنے والے برستے نہیں

اونہہ ـــــ یہ دقیانوسی باتیں ہیں۔ اس سائنسی دور میں گرجنے والے ہی برستے ہیں۔ شمی بیگم ـــــ‘‘

’’دیکھو مجھے بیگم نہ کہا کرو ـــــ بیگم سے مجھے کاہلی کی بو آتی ہے۔ ورنہ میں تمہیں شامی ڈینگو کہا کروں گی۔ وہ قہقہہ لگا کر ہنسا۔

سنو ـــــ ڈینگو پنگو میری دکھتی رگ نہیں ہے ـــــ لیکن تمہاری دکھتی رگ کا مجھے ضرور پتہ لگ گیا ہے ـــــ آج سے تم شمی بیگم بھی نہیں، بلکہ صرف بیگم

ہو ـــــ"

"شادی کو آنے دو اس گھر میں پھر بات ہو گی ـــــ"

"اوہ ـــــ وہ میری بیوی سے زیادہ تمہاری بھابی نہیں ہو گی۔"

"وہ میری سہیلی بھی تو ہے۔ ہم نے میٹرک تک تعلیم ایک ساتھ حاصل کی ہے۔"

"تو اس سے کیا ہوتا ہے بیگم ـــــ میں بھی تو کھیلا ہوں تمہاری سہیلی کے ساتھ۔ بالکل بدھو تھی تمہاری طرح۔ چھپکلی سے ڈرتی تھی ـــــ اور میں چھپکلی کی دم کاٹ کر اس کی گود میں ڈال دیا کرتا تھا۔"

"تو پھر بس ہمیں تم بیک وقت دو دم کٹی چھپکلیاں پاؤ گے۔"

"میں دیکھ رہا کہ ہوں کہ تم مجھ کو مستقل "تم" سے مخاطب کر رہی ہو۔ جب کہ میں جناب سے کچھ بڑا ہوں۔"

"صرف دس ماہ اور پندرہ دن ـــــ وہ مارا ـــــ بس تو کام ریڈیہ! مجھے "بیگم" کہو گے اور میں "تم"۔"

"اوں ـــــ ہونہہ ـــــ یہ میری کمزوری نہیں ـــــ تم نہیں جان سکتیں میری کمزوری ـــــ"

اور ـــــ شامی واقعی میں تمہاری کمزوری نہ جان سکی۔ لیکن تم اپنی کمزوری جانتے ہوئے بھی نہ سنبھل سکے اور ٹوٹ گئے ـــــ دو دن مستقل لوگ اپنے عزیزوں کی خبر لینے آتے رہے۔ تم ان کے درمیان خاموش بیٹھے رہے۔ نحیف و نزار ـــــ یا پھر تھیلہ بڑھا دیتے۔ اس میں اگر آپ کا خط ہو تو دیکھ لیں اور بس ـــــ اب ہفتہ سے زائد ہو چکا ہے ہم ـــــ شامی کے پاس جی بھر کے بیٹھ بھی نہیں سکتے۔ بھائی جان نے زیادہ باتیں کرنے سے منع کر رکھا ہے ـــــ شامی تو اب صرف شامی کی علامت ہے۔ ورنہ ہمارا شامی تو اداس شاموں کی نظر

ہو گیا ہے۔ ابا جان اور بھائی جان روزانہ شام کو اسے باہر لے جانے لگے ہیں۔
کتنے ہی سوالات کا ہجوم ہمارے سینے میں موجزن ہے۔ پڑوسیوں سے متعلق، سہیلیوں سے متعلق، چچا اور خالو سے متعلق۔ ہونے والی شاذی بھابھی سے متعلق۔ جن سے ملے اب تین سال ہو رہے تھے۔ شاذی کی رنگت خالہ پر تھی اور نقشہ بنگالی خالو پہ تھا۔ بھولا بھالا چہرہ۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھیں اور لمبے سیاہ ریشمی بال۔ پتہ نہیں اس دیش میں پٹ سن نے شاذی کے بالوں کا اثر لیا تھا یا اس کے ریشمی بالوں نے پٹ سن کا رنگ لیا تھا۔ ہماری پیاری خالہ شمسہ کی سرخ و سپید رنگت ہی تو ابا جان کے دوست مسیح الدین کو بھا گئی تھی۔ مسیح الدین بنک میں ملازم تھے بچپن سے آنا جانا تھا اور ہمارے نانا تقسیم سے قبل ہی بنگال میں ہی رہ رہے تھے اس لئے نانا جان کو کوئی اعتراض نہ ہوا۔ پہلے پہل جب ہم خالو کو اس طرح باتیں کرتے سنتے تو بے حد ہنستے تھے۔ بیٹا تمرا کھانا کھائی۔ شومیم ہمرے پاس آؤ — میرا پاس مشٹی ہے — آہا کیسا سندر کا پوڑ پہنا ہے — آؤ شربوت کھاؤ —"، خالو جان شربت پیتے ہیں کھاتے تھوڑا ہی ہیں —"
"آچھا — کھوب پیو —"
"ہائے الو آپ امی سے اردو کیوں نہیں سیکھ لیتے۔ اتنی خراب اردو بولتے ہیں۔" شاذی بگڑ جاتی۔
"معافی داؤ بیٹیا۔" خالو مسیح الدین بے تحاشا محبت کرنے والے انسان تھے۔
ڈوبتے سورج کی زرد شعاعوں نے بابا اور امی جان کو کیسا کمزور اور نڈھال کر دیا ہے۔ چچا۔ ماموں۔ خالہ کتنے ہی لوگ نہ جانے کس حال میں ہوں گے — اے خدا کیا وہ ہم سے زیادہ گناہ گار ہیں یا تو اپنے نیک بندوں کی آزمائش کرتا ہے۔"
امی جان آہستہ آہستہ کہہ رہی تھیں۔ شامی بھیا ابھی ابھی سیر سے لوٹے ہیں۔

قمیص اتار رہے تھے کہ اماں نے سینہ اور کندھے پر بڑے بڑے نیلے نشانات دیکھ
لئے۔ ہم سب انہیں گھیر کر بیٹھ گئے ——— " بیٹا کچھ ہنسو بولو ——— ہمیں وہاں کی
باتیں بتاؤ ناکہ تمہارا جی ہلکا ہو ——— میں سوچتی تھی تم آجاؤ گے تو سب کی خیریت
کی خبریں لاؤ گے ——— تم بولتے ہی نہیں ——— تمہارے جسم پر نشانات کیسے
ہیں ؟" یہ سن کر پھیکی سی حقارت آمیز مسکراہٹ ان کے لبوں پر پھیل گئی۔ کیا بتاؤں
اماں ۔ سب کچھ یوں ختم ہو گیا ہے کہ بتانے کو کچھ رہا ہی نہیں ———"

بیٹا ایسا مایوسی کی باتیں نہیں کرتے ——— اب تم اپنے گھر میں ہمارے درمیان
ہو ——— یہ نشانات کیسے ہیں۔ کوئی اور چوٹ تو نہیں ——— امی جان قمیض اٹھا
کر دیکھنے لگیں۔

" نہیں ——— اماں ——— میں آپ کو بتاتا ہوں ———" شامی کچھ دیر
کے لئے خاموش ہو گئے پھر بولے۔

میں اور میرا ایک بہاری ساتھی اپنے کمرے میں دبکے بیٹھے تھے کہ باہر گولیوں
اور دھماکوں کا شور اٹھا۔ پھر زور سے دروازہ بجا۔ میں نے جھری سے جھانکا
ایک لڑکی کھڑی تھی۔ دروازہ کھولا تو وہی تیرہ چودہ سالہ لڑکی ننگے سر اور ننگے
پیر دوڑ کر اندر آگئی۔ وہ ہانپ رہی تھی ——— خدا کے لئے مجھے چھپالو ——— مجھے چھپا
لو ——— میں تمہاری مسلمان بہن ہوں ———" ہم نے اسے فوراً لحاف اڑا دیا۔
تھوڑی دیر کے بعد چند غنڈے آنکلے۔ لڑکی کے بارے میں پوچھا۔ ہم نے حیرت
کا اظہار کیا اور تلاشی کے لئے کہہ دیا۔ وہ سرسری طور پہ دیکھ کر چلے گئے۔ لڑکی ساری
رات دم سادھے پڑی رہی۔ صبح وہی لوگ دوبارہ آئے اور بغیر پوچھے کمرے کا کونا
کونا چھاننے لگے اور لڑکی کو برآمد کر لیا اور ہم تینوں کی گردن پہ چاقوؤں کی نوک
رکھ کر نہ جانے کہاں لے گئے۔ وہ جگہ انسانی مذبح خانہ لگتی تھی۔ جہاں خون میں

لت پت انسانی لاشوں کا ڈھیر تھا۔ پہلے ہمیں خوب مارا پھر وہیں پھینک دیا۔
لیکن ہم زندہ رہے۔ دوسرے روز کچھ ہمت آئی تو ہم دونوں رات کو چھپتے چھپاتے
گھر واپس آگئے۔ کچھ دن وہیں بند رہے۔ رات کو چھپ کر نکلتے اور ضرورت کی
کوئی چیز لے آتے۔

"تم خالہ کے ہاں چلے جاتے ڈھاکہ۔ مسیح الدین ہی کچھ کر دیتا ——— ہاں امی۔
میں وہاں بھی گیا تھا۔ میں آپ کو بتاتا ہوں۔ میں اب بولتا ہی رہوں گا اور آپ سنتی
رہیئے ——— " اچھا پھر ان کی کوئی خبر ملی۔ سب کے خط آئے اس کا تو کوئی خط
ہی نہیں آیا۔ میں نے سوچا مسیح الدین نے کوئی انتظام کر لیا ہوگا۔ شمسہ کی طرف سے
تو تسلی تھی تمہاری ہی فکر تھی ——— " امی ذرا آگے بڑھ آئیں ——— " امی ——— میں
آپ کو سب کچھ بتاتا ہوں۔ میں اب چپ نہیں رہوں گا۔ جب میں ڈھاکہ دھان
منڈی پہنچا تو خالو جان کا گھر کھلا ہوا تھا۔ سامان بکھرا پڑا تھا۔ قبرستان کا سا سناٹا
تھا کہ پچھلے کمرے سے ہلکی ہلکی سسکیوں کی آواز آئی۔ میں نے جا کر دیکھا تو منا ہچکیاں لے
رہا تھا۔ وہ صرف یہی بتا سکا کہ سب کو پکڑ کر لے گئے ہیں۔ وہ وہیں پلنگ کے نیچے چھپ
گیا تھا ——— میں اسے لے کر کسی طرح واپس چاٹگام پہنچا۔ اس کی الگ داستان ہے
سارے مرد وحشی ہو گئے تھے ——— ساری عورتیں نیم مردہ تھیں۔ ان کی آنکھیں یوں
نکلی ہوئی تھیں۔ جیسے مردہ عورتوں کی آنکھیں کھلی رہ جائیں ——— سارے بچے چپ
ہو گئے تھے۔ خاموش چمگادڑوں کی طرح ماؤں سے چپکے رہتے تھے۔ منا دن رات میرے
کندھے پر سوار چپکا رہتا تھا۔ بالکل چپ چاپ۔ کوئی چیز میں اس کے منہ میں ڈال دیتا
تو کھا لیتا ——— اس نے خالہ کے پاس جانے کے لئے بھی کچھ نہ کہا۔ میں جھک کر اسے ذرا سا
الگ کر دیتا تو وہ ایسی بے بسی سے مجھ کو دیکھتا تھا کہ ——— پتہ نہیں میں کس طرح زندہ
ہوں "۔ سب پر موت کی سی خاموشی طاری تھی۔ میرے پاس کچھ پیسے تھے جو میں نے تکیہ

ہیں سی ڈالے تھے۔ سو چار رات کسی ڈاکٹر سے ملنے کے لئے طاقت کی دوا لے آؤں، میں اور میرا ساتھی باہر نکلے۔ چند قدم ہی دور گئے ہوں گے کہ ایک تنا تنہ لاش کا چہرہ روشنی میں چمکتا ہوا نظر آیا۔ شانوی وہاں کیسے پہنچی تھی مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آتا تھا۔ میرے دوست اور میں نے اپنے کرتے اتارے۔ ایک کرتے پر اسے لٹایا اور دوسرا کرتا اوپر ڈال کر تیز تیز دریا کی سمت بڑھے اور ہانپتے کانپتے اسے دریا کی لہروں میں بہا دیا۔ منا بدستور میرے کندھے پر سوار خاموش چپکا ہوا تھا۔ میں نے گردن تھک جانے کی وجہ سے اسے ٹھیک کرنے کے لئے ہاتھوں میں پکڑا تو وہ یوں میرے ہاتھوں میں آرہا جیسے پرانی دیوار کا پلستر اکھڑ کر گر پڑے۔ وہ مر چکا تھا۔ لہٰذا میں نے اسے ــــــــــ

" خدا کے لئے چپ ہو جاؤ شامی ــــ مت بولو شامی ــــ شامی تم چپ کیوں نہیں ہو جاتے آخر!" اور مجھے اب یہ دُبلا پتلا چپ چاپ سیدھا سادا شامی قدیم ظلم کے دیوتاؤں سے زیادہ ظالم۔ تنگ دل اور ڈراؤنا لگ رہا تھا۔"

(افکار ۱۹۷۳ء)

ایک میز تین پیالیاں

میری میز کے حصے میں صرف تین پیالیاں آئی تھیں۔ جب کہ اس کے گرد چھ کرسیاں لگائی گئی تھیں۔ نیور مائنڈ عادت کے تحت میں سلنڈر نما گلدان میں لگی نازک فرن کو دیکھنے لگی۔ اگر اس کے بیچ ایک کارنیشن کا پھول لگ جاتا تو یہ کیسا خوب صورت اور مکمل لگتا۔ میں ابھی اس لطف سے فارغ نہ ہوئی تھی کہ دیکھا بیگم حسن آ رہی ہیں۔
اور یہ پہلے لطیف لمحہ سے زیادہ خوشگوار لمحہ تھا۔ چھوٹا سا خوب صورت ہال مہمانوں سے بھرا تھا اور میری میز پر سوائے فرن اور تین پیالوں کے کوئی نہ تھا کہ بیگم حسن ایک چھوٹے سے قد کی معمولی سی خاتون کی طرف بڑھیں اور روالہانہ انداز میں گلے ملنے لگیں۔ ارے بیگم حسن اور ایں قدرتپاک۔ ہمیں کیسی کیسی باتوں پر یقین کرنا پڑتا ہے۔
دماغ کچھ سوچتا ہے۔ دل کچھ اور محسوس کرتا ہے۔ اور آنکھیں نہ جانے کیا کیا دیکھتی رہتی ہیں۔ مجھے یوں لگا جیسے نہایت خوب صورت ماں اپنے نہایت بدصورت بچے پر نچھاور ہو رہی ہو۔ وہ دونوں باتیں کرتی ہوئی قریب آ کر کھڑی ہو گئیں۔

"یہ میرے بچپن کی سہیلی شکیلہ ہیں۔" بیگم حسن مجھ سے مخاطب ہوئیں۔ اس خاتون نے مجھے دیکھا اور اپنی دانست میں مسکرائیں۔

"جی ہاں کافی عرصے کے بعد ہم ملے ہیں۔" وہ بولیں۔ گہرا سانولا رنگ چوکور چہرہ جیسے اینٹوں کے سانچے میں ڈال کر نکالا گیا ہو۔ چھوٹا قد، گٹھا ہوا جسم چھوٹے چھوٹے ہاتھ، چوکور ہتھیلی میں ٹھکی ہوئی مربع انگلیاں۔ صدیوں پرانا سینگوں والا ہیئر اسٹائل مجھے اس خاتون سے کچھ ہمدردی سی پیدا ہوئی کہ ایسی بھی صورتیں ہیں اس جہان پنہاں میں۔ لیکن وہ بیگم حسن کی شائستہ اور پر وقار مسکراہٹ کے مقابل یوں ہنس رہی تھی جیسے توپ کا دہانہ کھل گیا ہو اور ہنسی کے گولے ابل ابل کر میرے سینے پر پھٹ رہے ہوں۔ ہماری دوستیوں کی کیسی کیسی متضاد بنیادیں ہوتی ہیں۔ کوئی سر پیر ہی نہیں ہوتا اور ہماری دوستی ہو جاتی ہے۔ "میں ابھی آتی ہوں۔" بیگم حسن اسے لے کر ایک طرف چل دیں۔ نیورائنٹڈمیں حسب عادت میں فرن کی طرف متوجہ ہو گئی۔ فرن ایسی نازک اور تر و تازہ تھی کہ بغیر پھول کے بھی بری نہیں لگ رہی تھی۔ اکثر چیزیں نامکمل زیادہ خوب صورت لگتی ہیں۔ ترتیب حسن کا پہلا زینہ ہے۔ انتہائی ترتیب کا نام بے ترتیبی ہے کہ میں نے ایک پیالی اپنی طرف بڑھائی کہ مس رحمان خاموشی سے آکر میرے سامنے بیٹھ گئیں۔ ان سے کچھ روز قبل رسمی سی ملاقات ہوئی تھی۔ بیگم حسن سے پوچھا۔ میں نے بتایا کہ وہ شکیلہ کو لے کر بائیں جانب گئیں ہیں۔ ابھی یہیں آئیں گی۔

"اچھا ہوا میں بھی شکیلہ آپا سے ملنا چاہتی تھی۔" انھوں نے اپنی پیالی میں چائے انڈیلی اور رگڑائے ہوئے شکر دانے انگلی سے چپکا چپکا کر کھانے لگیں۔ مجھے ابھی ابھی کسی نے بتایا ہے کہ شکیلہ آپا کی بیٹی کا رشتہ ٹوٹ گیا ہے۔

I Felt so bad. وہ نرم دلی سے بولیں۔

"ہاں سنا تو میں نے بھی ہے۔ لیکن کیوں ٹوٹ گیا؟"

"پتہ نہیں چلتا اصل بات کیا ہے۔ اگر میں اصل بات بتانا شروع کر دوں تو سوچتی ہوں کہیں زیادتی نہ ہو جائے۔ رفعت پور۔ ایسے معاملات میں انسان کو بڑا محتاط ہونا چاہیئے۔" اس کی پیالی میں چائے یونہی رکھی تھی۔ باتیں اپنی طبعی عمر سے بڑھ کر کر رہی تھی۔ ہم لڑکیوں کی زندگی۔"

"آپ نے رفعت کو دیکھا ہے۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

"ہاں مجھ سے شاید جونیئر تھی۔ لیکن اچھی ملاقات تھی۔ رفعت شکل کی بھی اچھی ہے اور کلچرڈ لڑکی ہے۔ سوبر سی ہے۔ اچھا خاصہ کسی بیمہ کمپنی میں لگی ہوئی تھی۔ منگنی کے بعد ملازمت ترک کر دی۔ اس کا منگیتر پی آئی اے میں کسی اچھی پوسٹ پر تھا۔ وہ بہت خوش تھی۔ اس کی امی بے حد خوش تھیں۔ وہ ویسے بھی خوش طبع خاتون ہیں۔ زندہ دل اور رفعت کی منگنی پر تو ہوا میں اڑی اڑی پھرتی تھیں۔ کہتی تھیں۔ میرا داماد خوب صورت نوجوان ہے۔ بالکل میری بیٹی کے لائق۔ میرے بھیا نے اچھی طرح معلومات کر لی ہیں۔ لیکن پھر رشتہ کیوں ٹوٹ گیا۔" وہ آہستہ آہستہ باتیں کر رہی تھی۔ جیسے اپنے آپ سے مخاطب ہو۔

انسانوں سے متعلق انسان ہی کی باتیں کیسی مضحکہ خیز لگتی ہیں۔ تم نے سنا لڑکے والے کیا کہتے ہیں۔ وہ کہتے تھے لڑکی کا باپ زندہ نہیں ہے۔ ماموں کے پاس رہی ہیں اور وہ بھی لاپرواہ سے ہیں۔ شکیلہ آپا نے سنا تو خوب سنائیں۔ باپ نہیں ہے تو یتیم لڑکیوں کی شادی نہیں ہوتی۔ میں مرنے والے کو کیا شوکیس میں سجا کر رکھتی۔ اسے چاہیئے میاں کا خیال رکھے۔ جان نہ نکلنے دے اور یہ کہ اتنا بُرا بھلا کہا کہ انہیں رشتہ منقطع کرنا پڑا۔ لیکن دوسری جانب سے مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ رفعت کے منگیتر کا بازو کسی حادثہ میں بے کار ہو گیا تھا اور اب بھی کچھ نقص ہے جو انہوں

نے چھپا کے رکھا ہوا ہے۔" مس رحمن نے ٹھنڈی چائے کے بڑے بڑے گھونٹ بھرے اور خالی پیالی ایک طرف رکھ دی۔ پھر اپنی انگوٹھی سے کھیلنے لگیں۔

" رفعت کو اپنی ممی کا بڑا خیال رہتا تھا۔ شکیلہ آپا کو کتنا صدمہ ہوا ہوگا۔ میں دو تین بار گئی تھی سوائے رفعت کے کسی سے ملاقات نہ ہوسکی تھی۔ ان کے یہاں بچے کافی شریر ہیں۔ خوب ہنگامہ برپا کر رکھا تھا۔ رفعت خوش نظر آتی تھی۔ وہ بڑی سمجھدار اور بہت ذہین لڑکی ہے۔ شکیلہ آپا جیسی بظاہر رف سی لگتی ہے۔ دراصل ویسی نہیں بڑے اچھے دل کی خاتون ہیں۔ اپنے زمانہ میں ایک اچھی کھلاڑی تھیں لیکن رفعت کو کبھی کسی بات کے لئے مجبور نہیں کیا۔ بلکہ کہتی تھی رفعت جو دل چاہے کرے میں اپنی مرضی اس پر مسلط نہیں کروں گی۔ میں تو شکیلہ آپا پہ رشک کرتی ہوں۔ پچھلی دفعہ جب میں اس کے یہاں گئی تھی تو رفعت ماں کے جیتے ہوئے کپ پالش کر رہی تھی میں نے پوچھا۔ تمہارا جی نہیں چاہتا ایسے کپ حاصل کرنے کے لئے۔ کھیلوں میں تمہیں دلچسپی نہیں؟ تو کہنے لگی۔ دلچسپی ایک زمانے میں ہوتی تھی لیکن امّی نے منع کر دیا۔ اور کڑھائی پینٹنگ وغیرہ کی کلاسز جوائن کر لیں۔ میں نے اس کی پینٹنگ دیکھی ہیں ایسی زندہ تصویریں کبھی نہ دیکھی تھیں۔ ایک بار میں نے کہا۔ ایسے تر و تازہ پھول کم از کم کراچی میں پیدا نہیں کئے جاسکتے تو بولی۔ یہ خواہشوں کے پھول ہیں۔ ان پھولوں میں بہت سے جذبے شامل ہیں اور پھر ہنسنے لگی۔" مس رحمان یہ بتا کر پھر اپنی انگوٹھی سے کھیلنے لگیں۔ میں سوچنے لگی۔ چائے ابھی پینا شروع کروں کہ نہیں کہ شہلا خان کسی کی متلاشی ہمیں دیکھ کر رک گئیں۔ کیا بیگم حسن آئی ہیں۔" وہ اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے مخاطب ہوئیں۔

"جی۔ ابھی کچھ دیر پہلے شکیلہ آپا کے ساتھ گئی ہیں۔" مس رحمان نے بتایا۔

"اچھا۔" وہ اچھل پڑیں اور کرسی پر ہاتھ مار کر بولیں۔ "اتنے دنوں سے کسی کو سنانے کو جی چاہ رہا تھا۔" اور کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئیں۔ "ہائے کس قدر سناتے تھے۔ ہم سکو کو۔ اب تو زمانہ گزر گیا کسی کو سنائے ہوئے اور یہ موٹی کھال کی لڑکی ہماری باتیں سمجھتی ہی نہیں تھی۔ شہلا خان بتاتے ہیں میز پہ دھب دھب ہاتھ مارتی جاتی تھی۔ مس رحمان آہستگی سے اٹھ گئی تھیں۔

"اب تو شکیلہ خان اکیلی رہ رہی ہو گی۔ بڑی عجیب سی عورت ہے بھئی۔ ہم سے بہت چڑتی ہے۔ سنا ہے بیٹی کا رشتہ ٹوٹ گیا ہے۔ بے چاری بچی تو ٹھیک ٹھاک ہے۔" وہ میرے جواب کا انتظار کئے بغیر جاری و ساری رہیں۔ "اس کی باتیں دلچسپ اور کراری تھیں۔" چائے کا گھونٹ بھرا اور بولیں۔ "ہائے کیا بتاؤں ایک بار قسمت کی ماری کسی کام سے اس کے یہاں چلی گئی۔ ان دنوں یہ بھابی کے ساتھ رہ رہی تھی۔ ناشتہ کا وقت تھا۔ میں نصیبوں جلی برآمدے میں دیوان پر بیٹھ گئی۔ یہ دوڑی ہوئی باہر نکلی پہلے تو خود لپٹ گئیں۔ ہائے ایسے جھٹکے دیئے کہ کیا بتاؤں۔ بمشکل اسے علیحدہ کر کے بیٹھ گئی۔

اس نے یوں تو بے شمار کھانے کی چیزیں سجادیں۔ لیکن ایک جو کام کی چیز ہو کہ دو ننگ دھڑنگ بچے کمرے سے نکل کر دوڑے۔ اس نے لپک کر ایک کو نیکر پہنایا اور انگلی پکڑ کرلے آئیں۔ "آنٹی کو سلام کرو جانی۔ کرو بھئی آنٹی کو سلام۔" کہ مسز جانی نے پیشانی پر ہاتھ لے جا کر اور واپس میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ دے مارا کہ سوئیاں سی چبھنے لگیں۔

"بہت شریر ہے۔ نالائق کہیں کا۔ وہ انتہائی فیلشن ایبل ماں کی طرح بولیں پھر دوسرے کی طرف دوڑیں جو سابقہ منظر سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ پاجامہ ہاتھ میں۔ پیٹ نکلا ہوا۔ ناک بہہ رہی تھی۔ ہونٹوں پر دائرے کی شکل میں

انڈے کی زردی چھپاں تھی۔ شکیلہ بیگم نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اسے لاکر بٹھا دیا میری گود میں جملہ غلاظت کے ساتھ۔

"بیٹا آنٹی کو پوئٹری سناؤ۔" اور وہ کسی پس و پیش کے بغیر میری گود میں اچھل کود کر گانے لگا۔ اف میرا حال کچھ نہ پوچھو۔ اچھلتا رہا۔ مینڈک کی طرح۔ پھر میں نے کبھی جانے کی ہمت نہ کی۔" شہلا خان نے چائے کے دو گھونٹ بھرے۔ چاروں طرف گھوم کے دیکھا اور پھر کہنے لگیں۔ شکیلہ کے تو شادی کے دو سال بعد ہی شوہر کا انتقال ہو گیا تھا۔ بے چارہ ایسا عاجز رہتا تھا کہ میں سوچتی ہوں اچھا ہوا مر گیا۔ اس کا زندہ رہنا مشکل ہی تھا۔ اس عورت کے ساتھ۔ وہ تو سیدھا سادا آدمی تھا۔ شریف اور ملنسار یہ تو خود لونڈا ٹائپ تھی۔ دن بھر گھومتی تھی۔ گھر کے کاموں سے کبھی دلچسپی نہ ہوئی۔ وہی غریب گھر بھی چلاتا تھا۔ جب رفعت پیدا ہوئی تو میں نے اسے گھر پہ کچھ کام کرتے دیکھا۔ پھر ویسی کی ویسی بچی کو وہی اپنے پاس سلاتا تھا۔ ایک بار نیند میں بچی کو ایسا ہاتھ مارا کہ اس کی آنکھ سوج گئی۔ وہ مجھے بتا کر ہنستے رہے۔ شہلا کھلاڑی ماں کی کوئی ایک شکل ہے۔ کسی وقت ہاتھ چل جائے اور پھر دیکھئے۔ ابھی تک تو میں محفوظ ہوں۔ "کہاں محفوظ ہیں آپ۔" میں نے بات کاٹی تو شکیلہ بولی۔ یہ آگئی میری سوکن۔ کیا وقت تھا۔ ویسے رفعت کی شکل اپنے باپ پر ہے۔ معصوم۔ سوبر اور بھاؤنی سی۔" وہ پیالی ہاتھ میں لئے کچھ دیر سوچتی رہی۔

"آپ نے ایک ساتھ پڑھا ہے۔ شاید۔" میں نے پوچھا۔

"ایک ساتھ تو نہیں ویسے کافی ساتھ رہا یہ ہر سال ایک آدھ مضمون میں رہ جاتی تھی۔ اچھی کھلاڑی ہونے کی وجہ سے پرموشن ہو جاتا تھا۔ کھیلنے کا بے حد شوق تھا۔ کپڑے پہننے کا کوئی سلیقہ نہ تھا۔ بھائیوں کے کپڑے پہن کر چلی جاتی تھی۔ شکل و

صورت تو خیر اللہ کی بنائی ہوئی ہے۔ اس کی حرکتیں بھی بڑی عجیب ہوا کرتی تھیں۔ کالج کے زمانے میں ایک بار ہم تفریحی دورے پہ گئے۔ سارے سفر میں یہ ہمارے لئے مسئلہ بنی رہی۔ جب کسی مرد کے ساتھ بات کرنی ہوتی یہ دوڑ کر جھٹ پہنچ جاتے اور انداز یہ ہوتا کہ کولھوں پر ہاتھ رکھے سینہ تان کر سامنے کھڑی ہو جاتیں۔ مس باقر نے اسے خوب ٹھیک کیا۔ پہلے پہلے تو حیران ہی ہوتی رہیں۔ پھر پنسل نکال کر ہلکے سے چبھوتیں۔ "ڈیر چیسٹ اِن۔ گیٹ بیک" ہمارا ہنسی کے مارے برا حال ہو جاتا اور یہ سب اس کے اوپر سے گزر جاتا۔ صبح اٹھ کر یہ ورزش فرمائیں تو ایک نظارہ ہوتا۔ اندر کمرے کی کھڑکی سے مس باقر اور مس تاج بھی دیکھا کرتیں۔ وہ بنیان اور نیکر میں قلابازیاں کھاتی رہتی اور ہم ہنستے رہتے۔ مس باقر کہتیں اچھا ہے اتنی لڑکیوں کے ساتھ میل ممبر کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔ یہ کمی پوری ہو گئی ہے پھر تمام وزنی سامان بوقت ضرورت اسی سے اٹھوائے جاتے۔ ہمارے ہنسنے پر کہتی تھی۔ ہنسے جاؤ مجھے کوئی پروا نہیں ہے۔ دو چار بار ہنسو گی پھر دیکھنے کی عادی ہو جاؤ گی۔ تمہارا کیا خیال ہے تمہاری ہنسی سے میں اپنی خواہشوں کا گلا گھونٹ دوں گی۔" شہلا خان نے آخری گھونٹ حلق سے اتارے ہی تھے کہ انہیں دور بیگم حسن اور شکیلہ نظر آ گئیں۔ وہ اچانک اٹھ کر چلی گئیں۔ مجھے یہ دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی کہ صبا اپنی گاڑی کی چابی گھماتی ہوئی اندر داخل ہوئی تھی۔ میں نے آہستگی سے چمچ پیالی پہ بجائی اور وہ مجھے دیکھتے ہی سامنے آ گئی پھر پرس میز پہ رکھ کر سوں سوں کرنے لگی۔

"ایں۔ یہ کیا حرکت ہے۔"

"وہی تم تو جانتی ہو۔"

"بے شک میں کچھ کچھ جانتی ہوں لیکن مجھے یقین ہے کہ ہم سونگھنے کے لحاظ سے اس منزل تک نہیں پہنچ سکتے ورنہ جاسوسی کے لئے کتوں کا استعمال کیوں ہوتا۔

وہ کچھ نہ سنتے ہوئے بولی۔ شکیلہ جانی آئی تھی۔"

"ہاں۔ کیا سونگھ کر بتا رہی ہو۔"

"باڈی گارڈ خوشبو سے پتہ چل جاتا ہے۔ ویسے مجھے معلوم تھا کہ وہ آئیں گی۔ رفعت کی شادی ہونے والی تھی نا۔ اس لئے خالی پیالی آگے بڑھائی۔" "ہاں۔ نہیں ہو رہی رشتہ ٹوٹ گیا ہے۔"

"ارے۔ مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ شکیلہ نے مجھے جڑاؤ سیٹ دکھائے تھے۔ اور انگوٹھی کے لئے باہر سے ہیرے منگوائے تھے اور یہاں کی دکانوں سے انگوٹھیوں کے نمونے دیکھتی پھر رہی تھی۔" وہ ہولے ہولے چائے کے گھونٹ حلق سے اتار رہی۔ خاموشی کے بعد پھر گویا ہوئی۔ "تمہیں کیسے معلوم ہوا۔"

"مجھے تو سوائے اس کے کچھ نہیں معلوم کہ شکیلہ جانی بیوہ ہیں۔ تم لوگوں کی دوست ہیں اور اس کی بیٹی کی شادی ہونے والی تھی لیکن رشتہ ٹوٹ گیا۔

"ٹھیک تمہاری معلومات مکمل ہیں۔" وہ تمسخر سے بولی۔ "میں نے پچھلے دنوں یہ سنا تھا کہ وہ انجینئرنگ کا کورس کرنے گیا ہوا ہے لیکن پتہ چلا کہ لندن میں بیرے کا کام کرتا ہے۔ شکیلہ جانی سے پوچھا گیا تو کہنے لگیں۔ بیرا ہے تو کیا ہوا لندن میں تو ہے۔ وہاں کے بیرے ہمارے ملک کے ڈاکٹر اور انجینئر کے برابر ہی ہوتے ہیں اور حسب عادت قہقہے لگانے لگیں تھیں

"اچھا۔ چچا۔ تو کیا شکیلہ خود ہی ہنس رہی تھی۔"

"ہاں۔ وہ بڑی باہمت خاتون ہیں۔ میں بہت پہلے سے جانتی ہوں۔ ہم ایک ہی محلے میں رہتے تھے۔ میرے سامنے ان کی شادی ہوئی۔ کافی عمر میں ہوئی۔ بھائی بھابی ایسا برا سلوک کرتے تھے کہ سوتیلے بھی کیا کرتے ہوں گے۔ وہ تو انہیں دولہا بڑا نرم مزاج اور خاموش طبع ملا۔ وہ شکیلہ جانی کو ٹام بولائے کہا کرتے تھے۔ ان

کی زندہ دلی سے خوش ہوتے تھے۔ ایک دن کہنے لگے۔ عام طور پر شوہروں کی بیویاں ہوا کرتی ہیں لیکن میں بیوی کا شوہر ہوں۔ یہ انفرادیت بھی کسی کے نصیب میں ہوتی ہے۔ یہ خوشی انہیں راس نہ آسکی۔ رفعت ابھی ایک سال کی ہی تھی کہ شوہر کا انتقال ہوگیا اور شکیلہ جانی نے جو زندگی شوہر کے انتقال کے بعد گزاری ہے۔ میں بخوبی واقف ہوں۔ بھائی کے پاس رہتی تھی۔ بھابی نے اس قدر تنگ کر رکھا تھا اور ان کے بچے اس قدر شریر کہ الامان الحفیظ سخت بیمار پڑ گئیں۔ میں دو چار دفعہ ملنے گئی۔ یہ خاموش بیٹھی رہتی تھیں۔ ان کی پانچسالہ رفعت گم سم بازو پر سر لٹکائے کھڑی رہتی۔ کبھی کھل کر مجھ سے بات نہ کی کہ بھابی وہیں آتی جاتی رہتی تھیں۔ بات یہ ہے کہ انسان بڑی عجیب و غریب مخلوق ہے۔ بظاہر کچھ نظر آتی ہے، اندر سے کچھ اور ہوتی ہے۔ بعض کی ٹوٹ پھوٹ اندر جاری رہتی ہے اور بعضوں کی ظاہر ہو کر کوئی شکل اختیار کرلیتی ہے۔ شکیلہ جانی میں یہ ٹوٹ پھوٹ دو طرف سے رہی۔ اندر بھی ادھر باہر بھی ہم بہت کم دوسروں کے متعلق سوچتے ہیں اور جو تھوڑا بہت سوچتے بھی ہیں تو اپنے حوالے سے۔ ہم سب کی آنکھوں پر اپنی ذات کی عینک لگی ہوئی ہے۔

در اصل ہم سب بے حد خود غرض ہیں اور رہیں۔ اس کی آواز میں ارتعاش تھا۔ ارے صبا یہ تم ہو۔ میں نے سرگوشی کی۔ وہ بتانے لگی۔ ایک دن میں ندیم کو لے کر اس کے بھائی کے دفتر جا پہنچی۔ وہ ایسا انجان بنا سب کچھ سنتا رہا جیسے اسے کچھ پتہ ہی نہ ہو کہ اس کی بیوی شکیلہ پر اتنی زیادتی کرتی ہے۔ تم اسے سروس کی اجازت کیوں نہیں دیتے۔ میں بولتی رہی۔ وہ خاموش ہی رہا۔ پھر اتنا ضرور ہوا کہ اس نے بچی کو اسکول میں داخل کر دیا اور وہ خود بھی اسکول میں ملازم ہوگئی میرے اندر مستقل ایک سوال کلبلا رہا تھا۔ "صبا کیا تم مجھ سے متفق ہو کہ شکیلہ کا انداز گفتگو اور ظاہر کچھ پسندیدہ نہیں۔"

"ہاں۔ میں اسے ہمیشہ کہتی تھی یہ تم اس قدر ڈراؤنی کیوں بنی رہتی ہو۔ کچھ اپنے انداز بدلو۔ کوئی انسان بھی اتنا بدشکل نہیں ہوتا جس قدر وہ خود کو بنائے رکھتا ہے۔ بچے تم سے کلاس میں بلا وجہ ڈرتے رہیں گے۔ میری بات سن کر وہ مزید ڈراؤنے انداز میں ہنس پڑتی اور کہتی۔ "اپنے تحفظ کی سب کو ضرورت ہوتی ہے۔ سو یہ میرا انداز ہے۔ آخر ہر بڑا اور چھوٹا ملک اپنے دفاع کے لئے اسلحہ تو کیا ایٹم بم بھی تو بناتا ہے۔ جو اثر ڈراؤنے پن میں ہے وہ دلفریب چیزوں میں نہیں ہے۔"

"کیا تحفظ کی ضرورت تم کو ہی ہے۔ ہمیں نہیں ہے؟"

"نہیں۔ لیکن ہر عورت کے اپنے حالات ہوتے ہیں۔ حالات اور طبعی عملیات (اپنے سراپا پر ہاتھ سے اشارہ کر کے) کے لحاظ سے خود کو بنانا پڑتا ہے۔ خدا کی بنائی ہوئی چیزوں پر اس کے بندے ہنستے ہیں تو ہم کیا چیز ہیں۔ خود کو کتنا سنوار سکتے ہیں۔ سب مجھ پر ہنستے ہیں۔ ہنس لینے دو۔ میں ہزار بار خود پر ہنس لیتی ہوں۔ خود پر ہنسنا بڑی خوب صورت بات ہے۔ ہم خود بھی تو اپنے کہاں ہوتے ہیں۔ ہمارا وجود ہمارا اپنا نہیں یہ کئی حصوں میں بٹا ہوتا ہے۔ عورت، بیوی، بیٹی، بہن، ماں، محبوبہ اور نہ جانے کیا کیا کچھ۔ میرا خیال ہے میں بدصورت ہوں لیکن مجھے اس کا ذرا بھی احساس نہیں ہے۔ میں خود کو اتنی خوش نصیب انسان سمجھتی ہوں کہ میں اپنی مرضی کی مالک تو ہوں۔ سینی میں سجی ہوئی چاندی کے ورق لگی ہوئی مٹھائی نہیں ہوں جسے سب جھپٹ کر کھانے کی خواہش کریں۔"

"صبا جانی۔ یہ شکیلہ کے بارے میں تمہارے اپنے احساسات ہیں یا اس کے تھے کیونکہ شکیلہ کے لئے میں ایسے احساسات کی متوقع نہیں ہوں۔ وہ ایک کھلاڑی تھی اور کھلاڑیوں کے گفتگو و خیالات کا یہ انداز نہیں ہوتا ہے۔ وہ اپنے جذبات کا

انلہار بات چیت سے نہیں بلکہ جسمانی و عضلاتی ہلچل سے خارج کر دیتے ہیں۔"
صبا نے میری اس بات کا کوئی جواب نہ دیا۔
"بیوگی کے بعد جب سسرال کے رشتہ داروں نے پوچھا تک نہیں اور بھابی کی زیادتیوں کو سہہ کر جس انداز میں شکیلہ جانی نے زندگی گزاری ہے۔ شاید ہی کوئی گزار سکے۔ کچھ عرصہ اسے اکیلے انتہائی فضول محلہ میں رہنا پڑا۔ کھلاڑی تو تھیں ہی۔ مردانہ لباس پہن کر رفعت کو شام کے اندھیروں میں گھمانے کے لئے چل پڑتی۔ کچھ عرصہ تو وہ میلی دھوتی اور کرتا پہن کر سر پر میلی چادر کی پگڑی بنائے چھابڑی لگا کر بیٹھی رہی ہے اور کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی۔"
"نہیں یہ سب کیسے معلوم ہوا۔" میری بے چینی بڑھ گئی۔
"پتہ لگانا کون سا مشکل ہے۔ میں شکیلہ جانی کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ شاید وہ مجھ سے اتنا واقف نہیں جتنا میں ہوں۔
ایک دن میں نے فلم دکھانے کی دعوت دی تو کہنے لگیں میں دیکھ چکی ہوں۔ میں حیران تھی لیکن وہ تو ابھی ابھی آئی ہے اور اس کا لیٹ شو ہوتا ہے۔ بولیں تو کیا ہو۔ اپنی رفعت کو دکھاتا تھی۔ میں نے منور کا سوٹ پہنا اور دکھالائی اسے فلم۔"
"محلے والے کچھ نہیں کہتے؟"
ان کی ایسی تیسی۔ کیا لڑکی کا کوئی ماما چاچا نہیں ہو سکتا۔"
پھر بھی محتاط رہا کرو۔"
میری بٹیا اپنے تحفظ کا کوئی طریقہ معلوم کر لے گی۔ وہ شکل کی اچھی ہے۔ زیادہ مہذب بھی ہے۔ اس سے نفرت کوئی نہیں کرتا۔ اس لئے میں ایٹم بم بننے والے نسخے سے تو یہ ہیز ہی بتاؤں گی اور اس کے تحفظ کے لئے جلد ہی کوئی اچھا سا دولہا تلاش کروں

گی۔

بہت دنوں تک میں نہ مل سکی۔ بعد میں سنا کہ رفعت کی منگنی اچھی جگہ ہو گئی ہے۔ اسے بھائی واپس اپنے گھر لے آئے ہیں لیکن اب تم بتا رہی ہو کہ رشتہ ٹوٹ گیا ہے۔"

میں نے دیکھا کہ بیگم حسن، شہلا خان اور مس رحمٰن کو لے کر میری جانب آ رہی ہیں۔ یہ لیجیے۔ ہمارا انتظار ہو رہا تھا۔ یہ کہتے ہوئے بیٹھنے لگیں۔ شکیلہ کھڑے کھڑے بولیں۔ یہ صبا بیٹھی ہیں۔ ہماری پرانی ہمدرد ہیں۔ سنا ہے لکھتی بھی ہیں۔ لیکن پڑھنے کا کبھی موقع نہیں ملا۔ پھر ہاتھ لہرائیں جسم کو جھٹکے دیتیں مجھے دیکھ کر بولیں۔ "ان سے واقف نہیں بھئی معاف کر دو۔" اس کے بعد اچانک گھبرا کر کہنے لگیں۔ مجھے ابھی ابھی کوئی ضروری کام یاد آ گیا ہے۔ میں ذرا جلدی گھر پہنچنا چاہتی ہوں۔" اور یہ جا وہ جا۔ میں نے فوراً اپنی ذات کی عینک لگا کر شکیلہ کو دیکھنا شروع کر دیا۔ جس کے شیشے دھندلا گئے تھے وہ تیز تیز قدم بڑھاتی بہت آگے نکل گئی ہے کہ محض دھبہ سا محسوس ہوتا ہے۔ میری میز پر تینوں پیالیاں بے ترتیبی سے رکھی ہیں اور میں سوچتی ہوں کہ ہم تو دھبوں کی تعبیر بھی اپنی ذات کے حوالے سے کرتے ہیں۔ کون کیا ہے۔ کیا معلوم؟

ستمبر ۱۹۷۶ء

اِک تیری خاطر

ابھی ابھی تو سفید یونیفارم میں لڑکیاں بادلوں کی طرح آزاد بکھری تھیں۔ کچھ لڑکیوں کے ہاتھ میں ریکٹ تھے اور سفید چڑیا ریکٹ پر یہاں سے وہاں اچھل رہی تھی کہ اچانک جمنازیم میں بھگدڑ مچ گئی۔ لڑکیاں ایک کونے میں شہد کی مکھیوں کی طرح لپکیں۔ فضا ہائے گاڈ۔ آؤچ کی باریک آوازوں سے لبریز ہو گئی۔ میں کس قدر خوف زدہ تھی اور زریں۔ وہ درخت کی سب سے اونچی ٹہنی پر بیٹھی ایک ایک پتّہ کو یوں بغور دیکھ رہی تھی، جیسے بوٹنی کی کوئی اہم دریافت کرنے والی ہو۔

"زریں ڈیئر۔ تمہیں کچھ پتہ بھی ہے؟" میرا سانس پھول رہا تھا۔

"پتہ پتہ بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے۔ جانے نہ جانے۔" وہ گنگنانے لگی۔

کامریڈ سنو تو۔ افشاں ڈیئر بے ہوش ہو گئی ہے۔ اترو دیکھو تو سہی۔"

"سچ مچ کی بے ہوش ہے۔" ایک ہی جست میں وہ اتر چکی تھی۔ اس کی آنکھوں میں چمک آگئی تھی۔

ہائے میں ابھی دیکھتی ہوں۔ بھلا محبت میں بے ہوش کیسے ہو جاتے ہیں۔ بہت میٹھی ہو رہی ہو گی۔ اس کے محبوب کو مکھی بنا کر لے آنا چاہیئے۔ مکھی محبت اور مٹھاس۔ چھی چھی۔"

بکواس نہ کرو۔ آؤ چلیں دیکھیں۔"

ہم تیز تیز قدم اٹھاتے آگے بڑھے۔ وہ سسٹر روم میں تخت پر سیدھی لیٹی تھی اس کے سفید براق یونیفارم پر کیچڑ کے دھبے تھے۔ اس کا صحت مند جسم بڑا بھلا لگ رہا تھا۔ ورنہ تو عموماً اس عمر میں کراچی کی لڑکیاں یرقان کی ماری ہوئی لگتی ہیں۔ سانولا کندن کی طرح دمکتا چہرہ، معصوم سی ناک، وہی ٹیپ ہونٹ۔

افشاں کافی خوب صورت لگ تھی۔" اس نے دیکھتے ہی بشاشت سے کہا۔ میرا تو ایمان یہ ہے کہ لڑکیوں کو ہر حال میں پرکشش لگنا چاہیئے۔ ورنہ لڑکی بننے کا سارا مزہ جاتا رہتا ہے۔"

کچھ لڑکیاں اس کے گرد کھڑی تھیں۔ سسٹر نبض دیکھ رہی تھی۔

آج تو نوبت یہ ایں جا رسید کہ نبضیں بھی۔ میں اگر بے ہوش ہو کر اتنی پرکشش لگ سکتی ہوں تو ضرور محبت کروں گی۔ بتاؤ زریں کر لوں۔ وہ بڑبڑائے جا رہی تھی۔

"وسسٹر اسے ہوش آجائے گا؟" لڑکیاں پوچھ رہی تھیں۔

پہلے تو سسٹر نے نقاہت سے لڑکیوں کو دیکھا۔ "آجائے گا۔ آپ لوگ باہر جائیں سب۔"

وہ اتنی سستی اور بیزاری سے کہہ رہی تھیں کہ مجھے یقین تھا کہ ہوش آتے ہی وہ دوبارہ بے ہوش ہو جانا پسند کرے گی کہ اتنے میں مس جمیل بھی مسز فتح علی اور مس ماریا کو لئے اندر داخل ہوئیں۔

کیسے احتیاط سے قدم جماتی، سانس روکتی داخل ہوئی ہیں۔ گویا بدھ مت سے تعلق رکھتی ہوں۔" زریں مسلسل میرے کان میں بول رہی تھی۔

"اوہ میں بالکل تیار ہوں۔ مجھے بڑا اچھا لگ رہا ہے۔ میں بے ہوش ہونا پسند کروں گی۔ دیکھو تو مس مار با کیسے پیار سے کم بخت کی پیشانی پر ہاتھ پھیر رہی ہیں اور مس جمیل بھی۔ حالانکہ کل ہی اس کو بری طرح ڈانٹ پلائی تھی۔ دیکھو تو ادھر کون کون آ رہا ہے۔"

میں نے اسے گھسیٹ کر دوسری طرف کر دیا۔ اس کان میں ڈیئر۔" پہلا کان عنقریب پھٹنے والا تھا۔

ابھی پرنسپل بھی آئیں گی۔ پھر شاید کوئی اخباری نمائندہ بھی آ نکلے۔ کسی خبر کی تلاش میں اور تم بتا دینا۔ اس کالج کی ہر دل عزیز طالبہ تھی جس کے لاتعداد بوائے فرینڈز ہیں۔ ابھی ابھی محبتوں کی تاب نہ لا کر بے ہوش ہو گئی ہے اور محبوب مجازی سے جا ملی ہے۔

"دیکھو تو شاید اسے ہوش آ رہا ہے۔ ہل رہی ہے۔" میں نے اسے جھٹکا دیا کہ میرا دوسرا کان بھی چھلنی ہو رہا تھا۔

کالج کی یہ قابل فخر طالبہ جو کہ مستقبل کی بڑی "وہ" بنے گی۔ ابھی سے جدید محبت کے جدید ترین طریقوں سے واقف ہے۔ ہر چند کہ اساتذہ ان سے نالاں رہتے ہیں۔ دبانے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن ذاتی اکادش مطالعہ۔ تجربات اور فرانس کی مشہور جاسوس ماتا ہری کے حالات پڑھ کر انھوں نے اس صلاحیت کو جلا دی ہے۔ ہماری قابل فخر طالبہ جلد ہی افسران بالا کی۔" میں نے سختی سے اس کا منہ دبا دیا۔

"ہٹا لو ہاتھ، ورنہ ناک اور کان سے میری باتیں بہہ نکلیں گی۔" اسے چپ کرانا مشکل ہو گیا تھا۔ مس جمیل اور ساتھی اساتذہ مسکراتی ہوئیں واپس جا رہی تھیں۔ نرگس میرا ہاتھ چھڑا کر تیزی سے آگے بڑھی۔

"سسٹر یہ کیا مذاق ہے روزانہ آپ اسے بے ہوش ہونے دیتی ہیں۔ سارا الکوکو نہ

یہ چاٹ جاتی ہے۔ بس آج میں یا تو بے ہوش ہو کر رہوں گی یا اس کی تیمارداری کروں گی۔

سسٹر کچھ نہ سمجھتے ہوئے بولیں۔ جائیے، جائیے اور اپنے ساتھ اسے بھی لے جائیے۔ میری جان چھوڑیں۔"

زرّیں نے اسی دم افشاں کو ہاتھ سے پکڑ کر کھینچا۔ اور بھگاتی ہوئی باہر لے آئی۔

"ساری محبّت خود ہضم کئے جا رہی ہو۔ ہمیں بھی کچھ چکھاؤ۔ روزانہ بیسرت تمہارے متعلق مجھے بتا بتا کر جلاتی رہتی ہے۔ ریگولر لی کلاسیں اٹینڈ کر کے میرا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ اس نازک کچی عمر میں ایسی پکّی پکّی باتیں۔ دماغ سڑ گیا ہے۔"

زریں اسے مضبوطی سے تھامے درخت کے نیچے آکر بیٹھ گئی۔ کچھ اور لڑکیاں بھی جمع ہو گئیں۔ افشاں نے ایک مڑا تڑا پرزہ فائل سے نکالا اور یونیفارم کی جیب میں ڈال لیا پھر دونوں ہاتھوں سے اپنے صحت مند رخساروں کو تھپتھپایا اور بولی۔

"بہت ہی خراب نکلا ہے۔ میرے پیچھے ہی پڑ گیا ہے۔ کہتا ہے میں شادی کر کے دم لوں گا۔"

"یہ تو اچھا ہے۔ اماں باوا کی فکر دور ہو جائے گی۔" ایک لڑکی فوراً بولی۔

"اتنا جلدی نہیں۔ ابھی تو میری تعلیم ادھوری ہے۔ کم از کم بی اے تو کر لوں۔" ابھی تو میں بے بی ہوں۔" وہ لہک لہک کر گانے لگی۔" او مائی بے بی ڈارلنگ۔ یو آر سوئینگ۔ بٹ آئی لو یو۔

ذرا رکو میری جان۔ ابھی ابھی بے ہوش ہو کر آ رہی ہو۔ زریں نے اس کی مچلتی ہوئی ٹانگوں کو روک کر کہا۔ کچھ اور بھی تو بتاؤ قصّہ کیا ہے؟"

پرسوں جس کے ساتھ میرا اپائنٹ منٹ ہے نا وہ بڑا ہی اسمارٹ ہے۔ معلوم بھی ہے کس ڈیپارٹمنٹ سے ہے۔؟ خیر جانے دو۔ گزشتہ دنوں جس ہڑتال کو میں لیڈ

کر رہی تھی نا۔ وہاں ملا تھا۔" وہ اپنا گلابی رومال نکال کر سوں سوں کرنے لگی۔

میرے ساتھ تھوڑی سی لڑکیاں تھیں۔ کچھ تو ڈر کے مارے بھاگ گئی تھیں۔ باقی بھی ایک کونے میں دبک کر کھڑی تھیں کہ وہ صورت حال دیکھ کر اپنی مرسڈیز سے اتر آیا۔ میں نے لپک کر گریبان پکڑ لیا۔ آپ کو شرم نہیں آتی ہمیں یوں سڑک پہ مارے مارے پھرتے دیکھ کر۔ کہاں گئے ہمارے بھائی۔ قوم کی بہنوں اور بیٹیوں کا تحفظ کرنے والے۔ ادھر لڑکیوں نے نعرے لگانے شروع کر دیئے۔ کچھ پولیس والے آگے بڑھ آئے جونہی ایک توندیلا پولیس والا آگے بڑھا اور اپنا ڈنڈا مجھے دکھایا وہ مسکرایا اور اپھر بولا۔ "آپ ذرا گرفت ڈھیلی کریں تو میں جواب دے سکوں۔"

میں نے گریبان چھوڑ دیا۔ جا چھوڑ دیا تجھے... سمجھ کر... لڑکیاں مارے خوشی اور تجسس سے دہری ہوئی جا رہی تھی۔

"بے چارہ کیا یاد کرتا ہو گا۔ ان کرسی توڑ لوگوں کا یہی حشر ہونا چاہیئے۔" سیرت مکا تان کر بولی۔

دو دن کالج کے چکر لگاتا رہا۔ فون کیا۔ کہلوا بھیجا اپنے مسائل آکر مجھ سے بیان کریں تو آپ اور ہم تبادلۂ خیالات کریں گے۔" وہ ہنسنے لگی۔

"ہونہہ تو اس طرح ہڑتال اختتام کو پہنچی۔ گویا ہڑتال بھی اچھی چیز ہے بلکہ کافی اچھی۔" زریں نے سر ہلایا۔

"پچھلے ہفتے پرنسپل نے تمہیں اس سلسلے میں دفتر میں بلایا تھا۔" سیرت نے پوچھا۔

"ہاں بس وہ بڑھیا تو ڈانٹتی ہی رہتی ہے۔ کہتی تھیں کالج چھوڑ کر کیوں گھومتی ہو یہاں سے تم کہیں نہیں جا سکتیں۔ اگر گھومنا پھرنا ہے تو گھر سے والدین کی اجازت سے جایا کرو۔" وہ قہقہہ لگا کر ہنسی۔ "والدین کی اجازت سے۔ کیسی احمق ہیں والدین کی اجازت سے محبت کی پینگیں بڑھاؤں۔ ہمارے پاکستانی ماں باپ اتنے کنزرویٹو۔ توبہ کرو۔"

"اچھا چھوڑو۔ ان بزرگوار ہستیوں کو اور اپنے بوائے فرینڈز سے متعلق کچھ بتاؤ۔" لڑکیوں کا مارے بے چینی کے بُرا حال تھا۔

"پرسوں بہت گھومی تھی۔" وہ پھر رومال منہ پر رکھ کر کھی کھی ہنسی۔ عرب لڑکا تھا یہاں بنک میں ٹریننگ کے لئے آیا ہوا ہے۔ نوٹوں سے کوٹ کی جیبیں بھری ہوئی تھیں۔ لال بم۔ مجھ سے ذرا سا نکلتا ہوا قد۔ چھوٹی چھوٹی مونچھیں چوکور سی ہٹلر کٹ۔ ٹوٹی پھوٹی اردو بھی بول لیتا تھا۔"

"اُفوہ۔ کچھ آگے بھی بڑھو۔" لڑکیاں بے تاب تھیں۔

"ہم نے خوب سیر کی۔ اولڈ کلفٹن گئے۔"

"دھوپ میں۔"

"تو کیا ہوا اور بھی لڑکے لڑکیاں تھے کالجوں کے۔"

"اچھا تو باقاعدہ کنونشن ہوتا ہے۔"

"پوچھنے لگا۔ کیا کھاؤ گی؟" میں نے کہا گول گپے۔ لڑکیاں بے تحاشا ہنسیں۔

وہ اس نئی ڈش پر بہت حیران ہوتا رہا۔ میں نے بتایا۔ ہمارے ہاں جب پہلی دفعہ لڑکا لڑکی گھومنے جاتے ہیں تو گول گپے ضرور کھاتے ہیں۔ یہ گول گپے سید و شریف سے آتے ہیں پھر یہاں کے مقامی لوگ اس میں مصالحہ بھر کر تیار کرتے ہیں۔ یہ معدہ کے فعل کے لئے بڑے مفید ہوتے ہیں اور خون بھی صاف کرتے ہیں۔ وہ سوں سوں بھی کرتا رہا اور کھاتا بھی رہا۔ پھر میں نے فانٹا پی اور اسے بھی فانٹا پینی پڑی۔ اس کے بعد کہنے لگا۔ چلو کچھ شاپنگ کریں۔ میں نے کہا۔ آئیڈیا تو بہت اچھا ہے۔ لیکن میں گاڑی میں بیٹھوں گی۔ تم جو چاہو لے لو۔ میں پوری تمہاری پسند کی چیز چاہتی ہوں۔ بہت خوش ہوا۔ نیل پالش اور پرفیوم لا کر دی۔"

"اوہو۔ اسی لئے ساری بد بوئیں پھیلی رہتی ہیں۔" فضیلت نے چھیڑا لیکن اس

نے کوئی جواب نہیں دیا۔ پرس میں سے چیونگم نکال کر تقسیم کرنے لگی۔

آخری پریڈ کی بیل بج رہی تھی۔ لڑکیاں یہاں سے وہاں کلاسوں میں جاتی دکھائی دینے لگیں۔

"آؤ کم از کم یہ آخری کلاس تو اٹینڈ کر لیں۔" میں نے زریں کو پکڑ کر اٹھایا۔

"بے چاری مس مطیع اچھی ہیں۔"

"یہ اچھی کے ساتھ بے چاری کیوں لگا رہی ہو۔" وہ جل کر بولی۔

"اس لئے کہ اچھے بے چارے ہی ہوتے ہیں۔ اچھے لوگ سیکریفائس کرتے ہیں۔ آج کل کون اچھا بننے کی ہمت کرتا ہے۔"

"تمہاری تو ہر منطق نرالی ہے۔ کم از کم میری سمجھ میں نہیں آتی۔"

"کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی۔"

کالج میں کیا رواج چل نکلا تھا۔ ابھی جنریشن گیپ پورا پیدا بھی نہ ہو پایا تھا کہ بوائے فرینڈز کی وبا عام ہونے لگی تھی۔ سب ہی کا کوئی نہ کوئی بوائے فرینڈ تھا بلکہ کچھ لڑکیاں تو مقابلے پر آگئی تھیں۔ لہٰذا ایک ایک کے کئی کئی بوائے فرینڈز تھے۔ جو سائز، شکل، ذات پات کی قید سے آزاد تھے۔ ایسی صورت میں اگر مس خانم کہتی تھیں کہ لڑکیو! زندگی میں صرف ایک ہی بوائے فرینڈ ہونا چاہیئے اور وہ بھی ماں باپ کو ہی منتخب کرنا چاہیئے تو بھلا لڑکیاں کہاں سنتیں ان کی باتیں؟

"میرے خیال میں ہمیں بھی کچھ نہ کچھ کر لینا چاہیئے۔" یہ زریں تھی جو اچانک میرے پاس آکر بیٹھ گئی تھی۔

"کیا کر لینا چاہیئے۔ یہ لائبریری ہے۔ چلو باہر چلیں۔" میں اسے لے کر باہر آگئی۔

"وہی کچھ جو سب لڑکیاں کر رہی ہیں۔ میں کسی سے پیچھے نہیں رہنا چاہتی۔ لوگ کہاں سے کہاں پہنچ گئے ہیں اور ہم — کب تک اس MODESTY سے چپکے رہیں گے۔"

"بس اسی بکواس کے لئے مجھے لائبریری سے نکال کر لائی ہو ـــــ" میں واپس مڑی۔

"اوہ ـــــ بیٹھو تو ادھر ڈئیر ـــــ لائف انجوائے کرتے ہیں کوئی حرج نہیں ـــــ اسی ENJOYMENT کی خاطر لوگ کیا کیا کرتے ہیں۔ شائستہ کو دیکھو کالج چھوڑ کر اس قدر دور یونیورسٹی جانے لگی ہے۔ فٹ اسٹیپ پر لٹک کر جانا پڑتا ہے مگر اسکوپ زیادہ ہے ـــــ کھلی فضا ـــــ وسیع لان ـــــ خاموش سنسان گپھیں ـــــ اونچے نیچے ٹیلے ـــــ پارک سرخ کینا کے پھولوں کی بارش ـــــ"

"یہ تم کہہ رہی زریں ـــــ" میں نے بیچ میں ٹوک دیا ـــــ مکاری نہ کرو۔"

"بائی گاڈ ـــــ پھر نہ کہنا مجھے کچھ بتایا نہیں ـــــ" اور ہم گراؤنڈ کی جانب بڑھ گئے۔

چند دن وہ کالج سے غائب رہی۔ ایک صبح میں نے دیکھا آئی لائینر لگائے، ہلکی لپ اسٹک میں اور ناخنوں پر سرخ نیل پالش میں اتراتی ـــــ کلاس روم میں داخل ہوئی۔

"یہ تم ہو زریں ـــــ" میں پیچھے ہٹی ـــــ "کیا میں بے ہوش ہو جاؤں۔"

"نہیں یہاں نہیں ـــــ کلاس ہونے والی ہے ـــــ باہر چلو ـــــ وہاں موقع کی مناسبت سے ہونا۔ سسٹر بھی موجود ہے اور گلوکوز کے نئے ڈبے بھی آئے رکھے ہیں ـــــ" ہم دونوں باہر گراؤنڈ میں اپنے مخصوص بنچ پر بیٹھ گئے۔ اس کی آنکھوں میں شریر چمک تھی۔ کتنی معمولی سی لڑکی تھی۔ بوٹا سا قد، سانولا رنگ، کس کر بندھی ہوئی چٹیا ـــــ لباس سے بے پروا اور ہر دم مطمئن اور خوش رہنے والی۔ جیسے اسے دنیا کی تمام نعمتیں حاصل ہوں اور آج تو وہ کہیں زیادہ مسرور نظر آ رہی تھی۔

"کہاں غائب تھیں تم ـــــ؟" شازیہ۔ نسرین اور بصیرت نے بھی آ گھیرا۔

"لو روزانہ تو آ رہی ہوں ـــــ بھئی ـــــ بس ذرا ـــــ"

"ہائی جیکنگ ـــــ" سب کھلکھلائیں ـــــ ہائی جیکنگ

"زریں تم بھی — ناممکن ہے — ملّا جی۔ پرانی ناصح۔ بھلا کیسے بوائے فرینڈ پال سکتی ہے۔" سیرت نے کہا۔

"دیگراں را نصیحت خود میاں فضیحت —" نسرین بولی۔

"یہی سمجھ لو —" پھر وہ سایہ کئے ہوئے بادام کے تہ در تہ پتوں کو دیکھتے ہوئے بولی۔

"کافی اچھا لڑکا تھا بے چارہ —" اور اپنی فائل میں رکھا ہوا سفید رومال نکالا۔ تیز خوشبو پھیل گئی۔

"کوئی نیلی لگتا ہے مجھے تو۔ کیسی گندی بو ہے —" میں نے جلانے کے لئے اپنا رومال ناک پر رکھ لیا۔ وہ بہت محظوظ ہوئی — "کیا ہوا بھئی میرا پہلا تجربہ تھا۔ ہم تو زینہ زینہ اوپر چڑھتے ہیں۔ نیل۔ چنبیلی۔ موتیا۔ گلاب کا عطر — کولون پھر وکٹر، پروفلیبی اور پھر بادام روشئے چارلی۔ زریں شکست تو قبول کر ہی نہیں سکتی تھی۔

"بہت ہی شریف سا بوائے فرینڈ تھا۔ کہتا تھا میری کوئی بہن نہیں —" میں نے کہا۔ "لیکن میرے تو بہت سارے بھائی ہیں اور ہر وقت رعب جماتے رہتے ہیں۔ اس لئے مجھے پسند نہیں۔"

وہ گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ میں نے کہا۔ "تم تو کنوئیں کے مینڈک ہی لگتے ہو بس فہمیدہ بیگم نامی لڑکی سے شادی کر لو۔ تمہارے نصیبوں میں یہی کچھ ہے۔" کہ اشارہ ملا پروکٹر ادھر ہی آ رہی ہیں۔ لڑکیاں تیز قدموں سے کلاسوں کی جانب بڑھ رہی تھیں۔

اب فری پیریڈز تو کیا ہر پیریڈ میں جیسے ہی موقع ملتا۔ لڑکیاں فحش رسالے تصویریں اور کتابیں پڑھا کرتیں۔ کالج کے پاس سائیکل، اسکوٹر اور موٹریں وقفہ وقفہ سے نظر آتیں۔ پھر کچھ دور لڑکے نظر آنے لگے۔ روزانہ کوئی نہ کوئی لڑکی پرنسپل آفس میں پہنچائی

جاتی۔ مگر سب بے سود۔ لڑکیوں کے نام محبت ناموں اور ان کی سیر و تفریح میں اضافہ ہونے لگا۔ چوکیدار کا پہرہ سخت کر دیا گیا۔ کچھ کی ڈیوٹی بدل دی گئی۔ مگر وہی ڈھاک کے تین پات۔ لڑکیوں کے گچھے درختوں اور گیٹ سے چپکے نظر آتے۔ چوکیدار پٹھان سرخ سرخ ہو جاتا۔ وہ اسے اور چھیڑتیں اور قہقہے لگاتیں۔ گیٹ سے نکلنے کے کئی متبادل طریقے انہوں نے ڈھونڈھ لئے تھے۔ دو لڑکیاں آگے بڑھ کر کہتیں "خان! بیگم صاحب بلاتا ہے۔" پھر اچانک کوئی لڑکی زور سے چیختی۔ جونہی وہ مڑتا۔ لڑکیاں گیٹ سے باہر۔ یا پھر کبھی بڑے پیار سے آگے بڑھتیں۔ لالہ جی ایک بادام توڑ دو۔ صرف ایک بادام۔ وہ حیرانی سے کبھی لڑکیوں اور کبھی درخت کو دیکھتا، اور یوں روز نت نئی ترکیب میں پھنس جاتا —— والدین کو مطلع کیا گیا۔ مگر جواب ندارد نکال دینے کی دھمکی سب بے سود۔ ساری گیدڑ بھبکیاں —— پھر کیا ہوا پرنسپل خود ہر وقت گشت کرتی نظر آتیں اور ذرا سے شبہ پر بھی پکڑ کر دھوپ میں کھڑا کر دیتیں روزانہ ہی کوئی نہ کوئی لڑکی دھوپ میں نظر آتی اور زریں کے عشق کی داستانیں بدستور تھیں۔ وہ صاف بچی ہوئی تھی۔ "تم کیوں نہیں پکڑی جاتیں۔" میں حیران تھی۔

"یہ تو اپنے اسٹینڈرڈ کی بات ہے۔ میں مادام روشنے کے لیول پر آ رہی ہوں۔ آخر بوائے فرینڈ کی ٹائپ بھی تو ہوتی ہے۔ میں نتھو خیروں کو منہ نہیں لگاتی۔"

"بکو مت —— مجھے یقین ہے تمہارا کوئی بوائے فرینڈ ہے ہی نہیں ——" میری انسلٹ نہ کرو۔ میں احساسِ کمتری میں مبتلا ہو جاؤں گی۔ یہ دیکھو۔ وہ چوڑیاں دکھانے لگی۔ کانچ کی معمولی سی چوڑیاں تھیں۔

"وہ کہتا تھا بڑھیا لے لو۔ بلکہ بریسلٹ دینے پر مُصر تھا" میں نے کہا ابھی نہیں پھر کہنے لگا انگوٹھی لے دوں۔ میں نے کہا نہ بابا۔ یہ بڑی خطرناک چیز ہوتی ہے سوچ سمجھ کر پہنوں گی۔" وہ اپنے ناخن دیکھ کر شرارت سے مسکرائی ——

"پھر ہم نے ایک فلم دیکھی ـــ" "سچی ـــ قسم کھاؤ ـــ" آخر وہ کتنا جھوٹ بولتی میری سمجھ سے باہر تھا۔

"آئی سویر۔" وہ ہنسی ـــ "وہ تو تم ہو ہی نمبر ایک۔ اچھا کہانی کیا تھی؟"

میں نے بھی اتفاق سے وہ فلم دیکھ رکھی تھی۔ وہ کہانی سنانے لگی۔ واقعی درست سنا رہی تھی۔ مناظر اور کرداروں کا بیان بھی درست تھا۔ وہ بڑے موڈ میں تھی۔ کامن روم کے بیچ والے صوفے پر کافی دیر سے بیٹھے تھے۔ اگلا پیریڈ بھی فری تھا۔ جیسے ہی گھنٹی بجی کچھ لڑکیاں کلاسوں میں چلی گئیں اور کچھ ہمارے پاس آکر بیٹھ گئیں۔ وہ ایک میڈیکل کے طالب علم کے ساتھ گھومنے کا قصہ سنا رہی تھی۔ "وہ بے چارا بہت دبلا پتلا سا تھا۔ نام تھا نفیس۔ پہلے دن میں گئی تو اسے بتایا۔ مجھے ہلکا ہلکا بخار اور کھانسی ہوتی ہے۔ اس نے مجھے حیرت سے دیکھا۔ غالباً میں پہلی لڑکی تھی جو اس کے پاس آئی تھی۔ میری نبض دیکھنے لگا۔ میں شرمائی۔ جب اس نے اسٹیتھسکوپ لگایا تو مجھے گدگدی ہونے لگی۔ میں بن کر بل کھانے لگی۔ وہ بڑا محظوظ ہوا۔ پھر کہنے لگا پھر آئیے گا۔ آپ کا تو کچھ پتہ ہی نہیں چلتا۔ دوبارہ گئی۔ اکنامکس کا پیریڈ تھا۔ مس رجسٹر بند کر کے جیسے ہی بلیک بورڈ کی جانب بڑھیں۔ میں کھڑکی سے یہ جا وہ جا۔ وہی وقت تھا ملنے کا ـــ وہ مجھے دیکھتے ہی مسکرایا۔ مجھے بڑے زور کی ہنسی آئی کہ دوسرے لڑکے بھی دیکھنے لگے۔ وہ مارے اترا ہٹ کے بولا۔

"آپ کے کچھ غدود زیادہ ایکٹو ہو گئے ہیں۔" اس کا اپنا کمزور چہرہ کھنچا رہتا تھا۔

"اور آپ کے غدود کیا ہوئے ـــ شاید میرے اندر منتقل ہو گئے ـــ" وہ بغیر سنے بولا۔

"دیکھئے میں آپ کے لئے کیا لایا ہوں ـــ" اس نے جیب سے ایک پیکٹ نکالا۔

"کیا لائے ہیں یہ ـــ ہو گی کوئی اینٹی بایوٹک یا سلفاڈائزین کی قسم کی چیز ـــ"

زبردست پرفیوم تھی۔ اس کے بعد ہم بھٹی پارک گئے۔ وہاں کچھ پرانی طالبات بھی

تھیں۔ شفاف نیلگوں پانی میں ۔۔۔ سبز جھاڑیوں کے عکس میں پیر ڈالے بیٹھے رہے ۔ سپید تیرتی ہوئی بطخوں سے کھیلتے رہے۔

یہ کون سی جھیل کا ذکر ہو رہا ہے۔ اسکوٹر پر بیٹھ کر آپ لوزرن لیک تو جا نہیں سکتیں۔ البتہ جس نامی گرامی جھیل کا ذکر آپ کر رہی ہیں اس میں سالوں سے پانی جمع ہے۔ جواب کیچڑ میں تبدیل ہو چکا ہے۔ بطخ نامی کوئی چیز نہیں پائی جاتی ہے۔ البتہ مچھروں اور مینڈکوں کی آبادی سرعت سے بڑھ گئی ہے۔ لیکن وہ میری باتیں سنے بغیر اپنا راگ الاپتی رہی۔

ایک دن پتہ چلا کہ زریں کو بھی پرنسپل نے آفس میں بلایا تھا۔ کیوں؟ کچھ پتہ نہ چلا ۔۔۔ البتہ یہ حشر سامانیاں کچھ کم ہو چلی تھیں ۔۔۔ میں اپنے اسی بادام کے پیڑ تلے کتاب کھولے بیٹھی تھی کہ زریں آئی ہوئی دکھائی دی۔ آتے ہی بولی۔ "اس ہفتہ میں نے بے حد انجوائے کیا ہے۔ شاید ہی کبھی کیا ہو ۔"

" زریں خدا کے لئے بند کرو اپنی راگنی اور مجھے سچ سچ بتاؤ ۔۔۔ ورنہ مجھ سے بھی ملنا بند کر دو ۔"

" یہ کیسے ہو سکتا ہے ڈیئر ۔۔۔ اوہ ۔۔۔ تم ہمیشہ میرے حسین خوابوں کی دل فریب وادیوں میں کانٹے دجّال کی طرح داخل ہو جاتی ہو ۔"

میں اٹھ کر جانے لگی تو اس نے پکڑ کر بٹھا دیا اور ایک نوٹ بک بڑھا دی جس میں سارے قصے درج تھے۔

کہنے لگی افلاطون سے کسی نے پوچھا۔ حکیم جی کھانا کس وقت کھانا چاہیئے"

وہ بولے ۔۔۔ "امیر کو جب بھوک لگے تو غریب کو جب مل جائے اور ہم جیسے درمیانی لوگوں کو بھی تو کھانا کھانا ہوتا ہے ۔۔۔ کہیں نہ کہیں فٹ ہونا ہوتا ہے تو ہم اپنے تصورات کی دنیا سجا لیتے ہیں ۔۔۔ کبھی کبھی آئیڈیل ایگو میں پناہ ڈھونڈتے ہیں ۔"

"تو یہ ہے تمہاری آئیڈیل ایگو" ۔۔۔ میرے لہجے میں حقارت تھی۔۔۔"
"جو تم سمجھ لو۔۔۔ ہم جیسوں کے لئے افلاطون کے پاس بھی جواب نہ تھا۔۔۔"
وہ ایک کچی امبی ہاتھ میں دبائے درخت پر چڑھنے لگی۔
"ہائے کتنی ظالم امبیاں لگی ہوئی ہیں۔۔۔" وہ ایک ہی جست میں درخت کے اوپر تھی:
"اب نہ مجھے بلانا۔ فلاں بنت فلاں بے ہوش ہو گئی ہے۔۔۔ آؤ دیکھو۔۔۔"
اور میرا دل چاہا اسی لمحے بے ہوش ہو کر گر جاؤں۔

افکار۔ ۱۹۷۶ء

ریپ

سار ـــــــ ر ـــــــ ری دنیا ریپ* کے مرض میں مبتلا ہو گئی ہے۔ میں نے ''ٹائم'' اور ''نیوز ویک'' کے باتصویر رسالوں کو سرے ہوئے چوہوں کی طرح کرسی کی ٹانگوں میں گرے رہنے دیا۔ میرا ذہن دلدل بنا جا رہا تھا اور لگتا تھا۔ میں گٹر میں گر گئی ہوں۔ تمام غلاظت سے بھرپور گٹروں کے ڈھکن اسی طرح کھلے رکھنے چاہئیں۔ تاکہ گرنے والے بے دھڑک گرتے رہیں کچھ دیر پہلے میں نے سوچا تھا کہ موسم کا لطف اٹھاؤں گی۔ پام کے اجلے لمبے درخت سے ٹیک لگا کر اور ہری گھاس میں جلتے پیروں کی انگلیاں پھنسا کر ان رسالوں کی ورق گردانی کروں گی۔ آج کل ''پیپلز'' کیا کر رہے ہیں۔ مگر اس ورلڈ میگزین میں ریپ کا موضوع مستقل قابل توجہ بنا رہا ہے ـــــ میں ذہنی ریپ میں مبتلا تھی۔ وہی سر سبز لان تھا۔ سرخ گملوں کی قطاریں تھیں۔ بدتمیز چڑیاں ان گملوں کے گرد پھدکتی پھرتی تھیں کہ موسمی پھولوں کی پنیری اجاڑ دیں۔ سورج مکھی کے تابناک پھول تیز ہوا میں بغل گیر ہوئے جاتے تھے۔ مگر میرے ذہن میں خوف کا تیز ترین بلب

* Rape

روشن تھا۔ انسانی حیوانیت کے کتنے پردے واہوئے جاتے تھے۔ واہیات سیاسی خبروں سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔ لیکن پیپلز سے تو ہے۔ عورت کے تحفظ سے تو ہے۔ صوفیہ لارین کس فلم میں آرہی ہے۔ پال تیوبین کے مشاغل کیا ہیں۔ سڈنی پورٹر کیا کر رہا ہے۔ بگ ڈیڈی عیدی امین کے ننھے جانشین کے دودھ کے دانت گرنے شروع ہوئے ہیں کہ نہیں۔ شہزادی مارگریٹ کا کوئی نیا عشق؟ جیکولین کینیڈی آج کل کس جزیرے میں ہیں۔ کیرولین نے بھی کوئی پر پرزے نکالے ہیں کہ نہیں ——— مگر ریپ۔ اور سوائے ریپ کے وہاں کچھ تھا ہی نہیں

یہ تشدد اور جارحیت کی کون سی شکل ہے ——— سماج کشی کا ایک قدیم طریقہ ——— اسے کب تک دہرایا جاتا رہے گا ——— اٹلی میں ریپ کے ہنگامے نے کتنا طول پکڑا ——— لڑکیوں نے جلوس نکالے، بینر لئے لئے پھریں ——— حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی قوم ——— کیتھولک علیائیت کا امین اٹلی ——— عظیم تہذیبی ورثوں کی آماجگاہ ——— ساری بلند و بالا عمارتیں، منقش چھتیں اسی لمحے میرے سر سے گزر گئیں ——— کینٹربری۔ روما ——— وٹی کن سٹی۔ عظیم و پرشکوہ عمارتیں اور ستون۔ مگر کثیف دھوئیں میں نہائے ہوئے ——— ریپ کے خاتمے کا کیا حل ہے۔ کیا ایسی تمام ہولناک خبریں شائع کرنا بھی ہمارے ذہنوں کو ریپ کرنا نہیں ہے۔ میں کرسی سے ٹیک لگا کر بام کے جھالر دار پتوں کو گھورنے لگی۔ کرسی کے پچھلے پیر نرم گھاس میں دھنستے جا رہے تھے۔ کھلم کھلا ایسی خبروں سے ہمارے بچوں کے اخلاق کس تیزی سے بگڑتے جا رہے ہیں ——— اس دن نونی پوچھ رہا تھا، "آنٹی شہزادی این امید سے نہیں ہوئی۔ ملکہ فرح کی امید تو ہمیشہ اخبار میں آتی تھی۔ "

" ہاں بیٹے۔ بس اخبار والوں کی مرضی ہے کسی کی امید لگاتے ہیں۔ کسی کی امید نہیں لگاتے۔ " مگر میں نے اسے بدستور غیر مطمئن اور مزید کچھ سوال کی لگن میں پایا تو کہہ دیا۔ دوڑو بیٹے باہر۔ دیکھو۔ لچھے والا تو نہیں آیا؟ اس خیال کے آتے ہی میں نے رسالوں کو اٹھا کر اپنے پاس رکھ لیا۔ بچوں کے آنے کا وقت ہو رہا تھا۔ نیچے ایک خطرناک ترین قوم

ہوتے ہیں۔ ان کے سوالات اور طریقوں سے کافی ذلیل و خوار ہونا پڑتا ہے
کسی بھولے بھالے فطرت پسند نے کہا تھا۔ بچہ انسان کا باپ ہوتا ہے۔ مگر میں نے کئی
باپوں کو بچوں کے سامنے کیسے رسوا ہوتے دیکھا ہے ـــــ اور اب اسپین میں ریپ
کے واقعے نے تہلکہ مچا دیا تھا۔ اصل میں ہر واقعہ رونما ہی اس وقت ہوتا ہے جب
تہلکہ مچ جاتا ہے ورنہ تہلکہ مچائے بغیر کوئی عظیم سے عظیم واقعہ بھی رونما نہیں ہو پاتا ـــــ
تو ایک نوجوان لڑکی پر ریپ کے خلاف مظاہرے میں کئی نوجوان لڑکیاں بینر اٹھائے
شاہراہوں کے کنارے کھڑی تھیں۔ ہمیں بھی برابر کا انسان سمجھا جائے۔ تحفظ دیا
جائے۔ لڑکیوں کی ناموس کی بقا کی حکومت ضمانت دے ـــــ اور نہ جانے کیا کیا۔
یورپی ممالک اس قدر لبرل۔ آزادی نسواں کے علمبردار اور ـــــ آزادی کی یہ کونسی
شکل ہے۔ ان سے بھلا تو ہمارا مشرقی نظام ہے جس میں خواتین کو نعروں کی اجازت
بھی نہیں۔ یعنی سماجی نمونہ ہی ایسا ہے کہ نعرہ حلق سے اندر اتر جاتا ہے۔ پہلے تو
چونکہ کنویں ہوا کرتے تھے تو لڑکیاں اپنی عزت بچانے کو ان میں چھلانگ لگا کر جان
دے دیا کرتی تھیں۔ اب اگرچہ کنوؤں کی کمی ہے لیکن پھر بھی چوری چھپے اسی قسم کا
تحفظ وہ ڈھونڈ لیتی ہیں۔ لیکن چوراہوں اور شاہراہوں پر کھڑی نہیں ہو جاتیں۔
یہ یورپی عورتیں نہ جانے کس قسم کی واقع ہوئی ہیں کہ دندناتی شور مچاتی بھرے
بازاروں میں آکر عزت و عصمت کی بھیک مانگنے کھڑی ہو جاتی ہیں ـــــ میرے خیال
میں مخصوص واقعات کا ایک موسم ہوتا ہے۔ چنانچہ اس دور کا ایک اہم موسم جہازوں
کا اغوا ہے اور جہازوں کا اغوا اس صدی کا ایک نیا تصور ـــــ مگر ریپ کا موسم
ناقابلِ فہم ہے۔ یہ تو بہت پرانا تصور بلکہ عمل ہے جسے شدید جنسی پابندی کی بنا پر رونما
ہونا چاہیے۔ لیکن جہاں جنسی عمل کی ہمت افزائی کی جائے وہاں بھی ـــــ یقیناً کوئی
معاشی دخل ہے۔ اس میں جس مسئلے میں معیشت داخل ہو جائے، بڑا گھناؤنا بن جاتا ہے۔

میں نے ہر زاویے سے سوچنے کی کوشش کی۔ ایک جانب مغربی عورت۔ ایک جانب مشرقی خواتین۔ اچانک میرے سر سے کوئی چیز پھسل کر آنکھوں میں پھیل گئی۔ یہ کیسا اندھیرا تھا۔

"اوں۔ ہونہہ۔ رشنی کی بچی۔" میں نے اسے پکڑ کر سامنے کر دیا۔

"آنٹی آپ یہاں اکیلی بیٹھی ہیں؟" ــــ رشنی نے حسب عادت حیرت سے آنکھیں گھمائیں ــــ

"ہاں ایسی جگہوں پر اکیلے ہی بیٹھا کرتے ہیں ــ کپڑے بدل لو اور کھانا کھا کر باہر آؤ ــ وہ ابھی ابھی اسکول سے آئی تھی اور بغیر یونیفارم بدلے باہر چلی آئی تھی۔

"کھانا تو ہم کھا چکے ہیں۔ آپ کو خبر ہی نہیں۔ یونیفارم میلی ہے۔ شام کو بدلیں گے۔"

اس نے فیصلہ کن انداز میں کہا اور رسالہ میری گود میں سے اٹھا لیا۔ یہی تو فرق ہے آج کے اور پہلے کے بچوں کے درمیان۔ وہ عین اسی صفحہ کو بغور دیکھ رہی تھی میں نے اس کے ہاتھ سے رسالہ لینا مناسب نہ سمجھا، ورنہ ضد میں آکر وہ ہر صفحہ بلکہ ہر لفظ پوچھنے پر آمادہ ہو جائے گی۔ میں نے خود ساختہ جماہی لی اور اٹھ کر لیموں کے درخت کے قریب چلی آئی، اور شکر ادا کیا کہ اللہ میاں نے دنیا میں چند خوشگوار چیزیں بھی پیدا کر رکھی ہیں۔ ہرے ہرے کئی لیموں سبز پتوں کی اوٹ میں جھول رہے تھے۔ لیموں اور وہ بھی اتنے بہت سارے میرے منہ میں پانی بھر آیا۔

آنٹی! ریپ کیا ہوتا ہے؟ ــــ رشنی رسالہ لئے میرے پاس آکھڑی ہوئی۔

یا خدا ــ جی چاہا اسی ربن کی نوک سے پکڑ کر اسے پورا گول گول گھما دوں۔

آٹھ برس کی رشنی کو نویں ٹ میں پڑھتی ہے۔ جہاں کا ہر عمل عبادت ہوتا ہے۔

میں بغیر جواب دیئے پتوں کو ہٹا کر لیمو گننے میں منہمک رہی اور وہ کافی دیر خاموش کھڑی رہی۔ میں پلٹی تو وہ تصویر دیکھ رہی تھی۔

"کتنے لیموں ہوں گے شتی تمہارے خیال میں؟" میں نے پوچھا۔

"بہت سارے ہوں گے ــــ درخت جو ہوا لیمو کا ــ اس نے میگزین میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے لے کر بغل میں دبا لیا اور کیاری کی سرخ بنیری پر ٹک گئی۔

"آنٹی ریپ کیا ہوتا ہے۔ ؟" وہ میرے ساتھ جڑ کر بیٹھ گئی۔

ریپ ــ ریپ بھئی آپ اتنی چھوٹی ہیں ــــ میں کیسے سمجھاؤں؟ میں نے بے پرواہی سے کمروٹن کے پتوں کو مسلنا شروع کر دیا ــــ

"میں جو کچھ پوچھوں آپ کہہ دیتی ہیں تم چھوٹی ہو۔ سسٹر تو ہمیں سب کچھ بتا دیتی ہیں۔ وہ نہ بتائیں تو ہیڈ گرل بتا دیتی ہے۔ "

لڑکی تمہارا رجحان بڑا مسلیکٹو ہوتا جا رہا ہے۔ میں نے آہستگی سے دہرایا۔ تو کیا تم چھوٹی نہیں ہو۔ میں نے زور دے کر پوچھا ــــ

وہ تو میں ہوں کچھ کچھ ــــ لیکن سب باتیں معلوم ہونا چاہئیں۔ اس نے اسی یقین سے کہا ــــ

" اچھا ــ ابھی سوچ کر بتاتی ہوں ــــ سنو اس بار میں بہت سے لیموؤں کا اسکوائشنگ بناؤں گی ــــ پھر سب کو بھر بھر کر اسکوائش کی بوتلیں بھیجوں گی۔ گرمیاں آ رہی ہیں۔ سکنجبین کا مزہ سب بھول جائیں گے۔ تم میرے ساتھ رہنا۔ تمہیں بھی سکھا دوں گی۔ مجھے لگتا ہے تم تیزی سے بڑی ہونے والی ہو۔ تم اپنی مس گلوریا کو ایک بوتل پیش کرنا ــــ

"میں نہیں سیکھوں گی۔ مجھے اسکوائش پسند نہیں ہے۔ میں تو ہیئر ڈریسر بنوں گی۔ آپ نے ابھی تک سوچا نہیں آنٹی۔" وہ کہنی پر سر رکھے جواب کی منتظر تھی۔

"شنی آپ تو جھکی بڑھیا ہوتی جارہی ہیں بس ـــــ آپ کی سمجھ میں نہیں آئے گی یہ بات ـــــ جب ہم آپ کی عمر کے ہوتے تھے نا ـــــ تو اچھی اچھی کہانیاں سنا کرتے تھے۔ شہزادے، شہزادیوں، پریوں اور جنوں کی ـــــ"

مگر اب تو یہ ہوتے ہی نہیں پریاں۔ جن۔ شہزادے، شہزادیاں یہ سب کہاں چلے گئے ہیں۔" اس نے اپنی کسی ہوئی چٹیا پر مزید ربن کستے ہوئے پوچھا۔

"ہاں یہی تو معلوم کرنے اور سوچنے کی بات ہے کہ سب اچھی اور خوبصورت چیزیں آخر کہاں چلی گئی ہیں۔ زمانہ بہت بدل گیا ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ انسان بڑا خراب ہو گیا ہے۔ اسی لئے تو اچھی اور خوبصورت چیزیں روٹھ کر چھپ گئی ہیں۔ ان رسالوں میں انہی خرابیوں کا تو ذکر ہے۔ چوری۔ ڈاکے۔ جھوٹ بے ایمانی لڑائیاں سب بڑھ گئے ہیں۔ اب تم پوچھو گی کیوں آنٹی؟ ـــــ تو بھئی وہ جن بھوت، چڑیلیں جو باہر سے انسان پر حملے کرتے تھے، میرے خیال میں انسان کے اندر داخل ہو گئے ہیں اور انسان خود جن بھوت بن کر سب انسانوں کو نقصان پہنچا رہا ہے۔ ڈراؤنا، خونخوار انسان ـــــ تو اب انسان خود گھسٹیا کی بھتنا شاہی بن گیا ہے۔ آپ نے وہ کہانی ہی نہیں پڑھی۔ گھسٹیا کی بھتنا شاہی

اردو میں ہے نا ـــــ میں نہ جانے اسے کیا کیا بتا رہی تھی۔ وہ اپنا چہرہ اوپر کئے غور سے سنتی رہی پھر بغیر جواب دئیے رسالہ اوپر اٹھا کر دیکھنے لگی۔ ... نئے سرے سے تصویروں کو دیکھا۔ پھر گھاس پر پڑے تنکوں کو مروڑتی رہی۔ چیونٹیوں کو دیکھتی رہی اور اس کے ہونٹ آہستہ آہستہ ہلتے رہے اور پھر بڑی سنجیدگی سے بولی

"آنٹی مجھے معلوم ہے ریپ کیا ہوتا ہے؟" اس نے گویا انکشاف کیا۔

"یا خدا ـــــ" مجھ پر لرزہ طاری ہو گیا۔ میں نے اسے دیکھا تو وہ مسکرا رہی تھی۔ ـــــ اچھا ـــــ تو بس ٹھیک ہے۔ اب جاؤ اچھی بچی کپڑے بدل لو ـــــ ابھی

ماسٹر صاحب پڑھانے کے لئے آتے ہوں گے"۔۔۔ اور وہ اٹھ کر چلی گئی۔

بچے بھی کیا ہوتے ہیں۔ بھولے بھالے معصوم!۔۔۔ کیسی کیسی باتیں کرتے ہیں۔ دعوے کرتے ہیں۔ جستجو اور کھوج کا جذبہ کبھی کبھی انہیں دیوانہ بنا دیتا ہے مجھے شنّی پر ہنسی آنے لگی۔۔۔ اور میں دوبارہ انہی رسالوں کی ورق گردانی کرنے لگی۔ میرے ذہن میں بدستور عورتوں کی چیخیں، شور اور نعرے پتھریلی چٹانوں سے لڑھکتے پتھروں کی طرح دھماکے پیدا کرتے رہے۔ اسپین میں ہونے والے حالیہ ریپ کے واقعہ پر مردوں نے چند تاویلات پیش کی تھیں۔ مثلاً رات گئے عورتیں گھروں سے کیوں نکلتی ہیں قابل اعتراض لباس میں پھرتی ہیں وغیرہ وغیرہ۔ عورتوں سے متعلق دنیا کے سارے مردوں کی سوچ ازل سے وہی ہے۔ لیکن کیا باپردہ عورتوں کا تحفظ بھی رہا ہے؟ اے عورت تیری کیا سوچ ہے! تیرا تشخص کیسے قائم ہوگا اس مرد کے معاشرے میں۔

"دیکھیے جی۔ نونی کیا کر رہا ہے۔" فضل مجھے بتا رہا تھا اور واقعی نونی ٹائم کے سرورق پر بنی حسینہ کی خوب گھنی داڑھی مونچھیں بنا چکا تھا۔۔۔ ارے نونی۔ تم ابھی سے اس خاتون کے وجود کو برداشت نہیں کر سکتے۔ میں نے اسے چپت رسید کر دی اور وہ ربڑ کی گیند کی طرح اچھل کر پرے کھڑا ہنسنے لگا۔

بی بی جی۔۔۔ اسٹور میں شنّی گند پھیلا رہی ہیں۔ سارے اخبار پھیلا دیئے ہیں۔ "کرنے دو اُسے گند۔ بھابی سے کہنا وہی درست کریں گے۔۔۔ نہیں آپ منع کر دیں۔ آپ کا کہا مان لیں گی۔ یہاں تو ہر ایک بضد نظر آتا تھا۔۔۔

"شنّی جان یہاں آؤ۔۔۔ موٹی آؤ۔۔۔ آؤ ایک نئی بات بتانے لگی ہوں آپ کو۔۔۔" میں نے آواز دی

کچھ دیر کے بعد وہ ایک اخبار لئے دوڑی دوڑی آئی اور میرے سامنے پھیلا کر ایک خبر اور تصویر پر انگلی رکھ دی۔۔۔

"پچیس سالہ نوجوان عمر دین کا ایک سات سالہ بچی پر مجرمانہ حملہ۔ عمر دین کو ایک کھلے میدان میں۔ ہزاروں تماشائیوں کے سامنے کوڑوں کی سزا ——"

"ہاں درست ہے۔ تو پھر کیا ہوا۔ میں اٹھ کھڑی ہوئی —— یہی تو ہوتا ہے ریپ! —— وہ آنکھ میچ کر مسکرائی اور میں سانس روک کر سوچنے لگی۔ کیا ساری دنیا ریپ کے مرض میں مبتلا نہیں ہو گئی؟

افکار۔ ۱۹۷۸ء

کہانیوں کا یہ مجموعہ یقین دلاتا ہے کہ خالدہ شفیع خالص انسانی زاویۂ نگاہ سے انسانوں اور زندگی کو دیکھنے اور محسوس کرنے والی ایک تخلیقی افسانہ نگار ہیں۔ علامتی، اساطیری اور تجریدی اسالیب کے اس ہنگامہ پرور زمانے میں کسی شبک، رو جھرنے جیسی متوازن رفتار اور نغمگی رکھنے والے لہجے کی یہ افسانہ نگار کہانیاں "ڈھونڈنے اور کہانیاں سنانے کا ہنر جانتی ہیں خالدہ شفیع نے اس حقیقت کو پالیا ہے کہ بنیادی اور اصلی چیز تو کہانی کا کہانی پن ہے اور باقی سب چیزیں اضافی ہیں اور کچھ مصنوعی۔

خالدہ شفیع جن کرداروں کی کہانیاں سناتی ہیں اُن کے ساتھ خود بھی اسی معاشرے کے جہنّم اور جنّت میں سانس لیتی ہیں۔ معاشرہ جسے انسان انسانیت کی خوشبو سے مہکا کر جنّت بناتا ہے اور کبھی اپنے منصبِ اعلیٰ سے نیچے اُتر کے جہنّم میں بدل دیتا ہے۔ خالدہ شفیع مصلح ہیں نہ مبلّغ ۔ وہ تو ہمارے ہی دُکھ سُکھ محرومیاں، ناآسودگیاں اور کم کم ملنے والی خوشیاں لکھتی ہیں اور ہمارے باطن کی اُلجھنیں کہانیوں کے آئینے میں دکھا کے اور ہمیں سوچنے پر آمادہ کر کے، خاموش ہو جاتی ہیں۔ اسی لئے تو ان کی ہر کہانی ہمیں اپنی کہانی معلوم ہوتی ہے۔

اس بے حس مشینی، کاروباری اور جنس زدہ معاشرے میں بھی انسانوں اور زندگی کو تلخ اور حقارت آمیز انداز سے نہ دیکھنے کا عمل جو اِن کہانیوں سے نمایاں ہے، ظرف کی کشادگی چاہتا ہے اور انسان کی سرشت میں خیر کے جوہر پر یقین چاہتا ہے۔ خالدہ شفیع میں بلاشبہ یہ دونوں وصف ہیں۔

آخر میں ایک عجیب بات کہنا چاہتا ہوں جو میں نے محسوس کی ہے۔ خالدہ شفیع کی نثر میں پلک تک آکر رُکے ہوئے آنسوؤں سے پیدا ہونے والا گداز ہے جو ہمیں عام طور پہ درد و غم جمع کر کے دیوان کی صورت دینے والے غزل گو شعرا کے لہجے میں ملتا ہے۔

حسن اکبر کمال

پچھلے چند برسوں میں ہمارے ادبی اُفق پر کچھ نام اس طرح چمک اُٹھے ہیں کہ دیکھتے ہی دیکھتے سب کی نگاہوں کا مرکز بن گئے ہیں۔ ان میں خالدہ شفیع بھی شامل ہیں۔ میری رائے میں خالدہ شفیع اس اعتبار سے دوسرے ناموں سے ممیز ہو سکتی ہیں کہ ان کی تابناکی میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے ان کا فن نکھر رہا ہے۔ ان کی نگاہ زیادہ تیز ہیں اور ان کے مشاہدے میں مسلسل گہرائی آ رہی ہے۔

خالدہ شفیع کا فن۔ ایک افسانہ نگار کا فن ہے۔ افسانہ لکھ لینا کوئی بڑی بات نہیں۔ افسانہ نگار کا فن کارانہ کمال یہ ہے کہ وہ اپنے نوکِ قلم پر وہی کچھ لائے جو لوگوں کے دلوں میں ہے مگر اپنے منفرد اسلوب کے ساتھ۔ اپنے مخصوص زاویۂ نگاہ سے اور خالدہ شفیع نے یوں تو کہی جانے والی عام باتیں ہی کہی ہیں لیکن اپنی فن کارانہ انفرادیت اور اسلوبی تشخص ہر جگہ برقرار رکھا ہے۔ علامہ اقبال نے اسی خوبی کو "ہمہ شد، باہمہ او" کے الفاظ سے منع کیا ہے۔

خالدہ شفیع کو ہمارے معاشرے کے معاشی مسائل سے گہری دلچسپی ہے۔ وہ ان مسائل کے ارد گرد بڑی خوش اسلوبی سے واقعات کا تانا بانا بُنتی ہیں اور جس مرکزی خیال کو اہمیت دینا چاہتی ہیں وہ کبھی تو ان واقعات کی سطح پر آ جاتا ہے اور کبھی کسی حادثے کی لہر اسے بہا کر کہیں دور لے جاتی ہے مگر یہ مرکزی خیال آخر میں اس طرح اُبھر کر قاری کے ذہن پر چھا جاتا ہے کہ اسے ایک عجیب سی ڈرامائی مسرت ہوتی ہے جس کا اظہار وہ کرنا بھی چاہے تو غالباً نہیں کر سکتا۔

خالدہ شفیع کہانی کہنے کا انداز خوب جانتی ہیں۔ وہ جانتی ہیں کہ کسی انسانی مسئلے کا کہانی کے پیرایے سے کیا ربط ہوتا ہے اور کہانی اور مسئلے کا ادغام فنی محاسن کے ساتھ کس طرح ممکن ہے۔ چنانچہ ان کے یہاں قاری کو کہیں بھی یہ ناگوار احساس نہیں ہوتا کہ افسانہ نگار نے محض ایک مسئلے کی خاطر کہانی لکھی ہے۔ کہانی کے اندر مسئلہ موجود ہوتا ہے لیکن اس کی موجودگی کہانی کے فطری بہاؤ کو کسی طرح بھی متاثر نہیں کرتی اور میں سمجھتا ہوں یہ خالدہ شفیع کی بطور ایک افسانہ نگار کے سب سے بڑی خوبی ہے۔

وہ اپنے افسانے کا آغاز کسی "ہنگامہ آرائی" سے نہیں کرتیں۔ اس کے باوجود قاری کے ذہن میں ایک سوال پیدا کر دیتی ہیں مثلاً "کیسے کیسے لوگ" کی پہلی سطر یہ ہے۔

"شادی کے گھر میں اس قدر سناٹا؟"

"ایک میز، تین پیالیاں" کی سب سے پہلی سطر ہے

"میری میز کے حصے میں صرف تین پیالیاں آئی تھیں جبکہ اس کے گرد چھ کرسیاں لگائی گئی تھیں"

میز کے گرد چھ کرسیاں اور میز کے اوپر صرف تین پیالیاں۔ آخر کیوں؟

یہ فقرے قاری کے باطن میں ایک قسم کی استفہامیہ کیفیت پیدا کر کے اسے غیر شعوری طور پر کہانی کے مطالعے کی ترغیب دینے پر منتج ہوتے ہیں۔

خالدہ شفیع اپنے افسانوں میں بڑے خوبصورت، معنی خیز فقرے لکھ کر انہیں بہت دلچسپ بنا دیتی ہیں

ان کا مشاہدہ بڑا گہرا اور حقیقت پسندانہ ہوتا ہے "کیسے کیسے لوگ" میں یہ الفاظ ملتے ہیں۔

"قمیص میں دائیں طرف لگی ہوئی جیب انواع و اقسام کی اشیا سے پُر بکری کے دودھ بھرے تھن کی طرح لٹک رہی تھی"

خالدہ شفیع کہانی کے بنیادی تقاضوں کا پورا پورا خیال رکھتی ہیں۔ کہانی مختصر ہو جیسی "ایک میز، تین پیالیاں" یا "گل ہی نہ جانے" یا طویل کہانی "تو پھر زندگی کیا ہے؟" وہ بڑی سہولت، بے ساختگی، یکساں رفتار سے جو کچھ کہنا چاہتی ہیں کہہ دیتی ہیں۔ غالب کی زبان میں اسے سادگی و پُرکاری کہہ سکتے ہیں۔

مجھے مسرت ہے کہ خالدہ شفیع اپنے معاشرے میں رہ کر اسیرِ تخیلات نہیں رہیں بلکہ وہ اس کی ہر ہر کروٹ سے بخوبی واقف ہیں اور حقیقتوں کی تلاش میں انہوں نے نہ تو کوتاہ نظری سے کام لیا ہے اور نہ سست روی سے۔ انہوں نے اپنے عہد کے زندہ حقائق کو بڑی گہری نظر سے دیکھا ہے، پرکھا ہے اور انھیں زندگی کی دھڑکنوں سے معمور انداز میں پیش کر دیا ہے۔

میرزا ادیب

خالدہ شفیع تقریباً ۲۰ برس سے مختصر اور طویل افسانے لکھ رہی ہیں۔

۱۹۶۰ کے بعد سے اب تک صنفی اعتبار سے اُردو افسانہ بہ لحاظ تکنیک و موضوعات جن نوع بہ نوع تجربات سے گزرا ہے اُردو کے افسانوی ادب کی پوری تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔

نیا کہلانے اور نئے رجحانات کے بانیوں میں شمار ہونے کے شوق میں نئی نسل کے ہمارے بیشتر افسانہ نگار اپنی تخلیقی کاوشوں کے نتیجے میں اُردو افسانہ نگاری میں کوئی نیا سنگ میل قائم کرنے میں ناکام رہے ہیں۔

خالدہ شفیع کا شمار ہمارے ان نئے افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے کہ جنھوں نے افسانے میں موضوعات و تکنیک کو نہ تو کسی رُجحان کا بانی ہونے کی خاطر استعمال کیا اور نہ ہی تجربہ برائے تجربہ کی خاطر اپنے تخلیقی جوہر کو رائیگاں جانے دیا۔ ان کی کہانیوں میں "کہانی" موجود ہے اور کردار ہمارے ارد گرد پھیلے ہوئے دُکھ سُکھ سہتے انسان ہیں۔

خالدہ شفیع کے افسانوں کا پہلا مجموعہ "بدلتے رنگ شگوفوں کے" اُردو افسانے میں ایک قابل قدر اضافہ ہے۔

مشرف احمد